اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

کارِ دعوت میں درپیش مشکلات اور داعیانِ دین کا طرزِ عمل	حافظ طاہر اسلام عسکری	3

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	لطف الرحمٰن خان	5

بحث و نظر

اہل سنت کا تصورِ ''سنت''(۲)	حافظ محمد زبیر	14

فکر و نظر

جماعت سازی اور اس کی بنیادیں(۴)	قاری یحییٰ اشرف عبدالغفار	61

بیان القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

حرفِ اول

کارِ دعوت میں درپیش مشکلات
اور داعیانِ دین کا طرزِ عمل

موجودہ زمانے میں اہل اسلام جس ذلت ونکبت اور پستی وزبوں حالی سے دوچار ہیں' اس پر ہر قلب حساس بے چین ومضطرب ہے۔ اُمت کا ہر فرد سوال کناں ہے کہ کیا اس رسوائی سے نجات پانے کی بھی کوئی راہ موجود ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں مختلف مفکروں اور دانشوروں کی طرف سے انتہائی تفصیلی اور دقیق تجزیے اور بظاہر بڑے خوشنما لائحہ ہائے عمل پیش کیے جارہے ہیں' لیکن اربابِ علم ودانش کے پیش کردہ سارے منصوبے قطعی طور پر ناکام ہو چکے ہیں' جس کے نتیجے میں اُمت مسلمہ کی حالت روز بروز دگرگوں ہوتی جارہی ہے۔

تأمل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اس ناکامی ونامرادی کا اصل سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نام نہاد اصحابِ فکر ونظر انسانی زندگی کے مسائل کے فطری وحقیقی اور شافی حل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے محض عقلِ انسانی پر بھروسہ کر کے مسائل زندگی کی گتھیاں سلجھانا چاہتے ہیں' اور یہ ظاہر ہے کہ قیامت تک ناممکن ہے' کیونکہ انسانی عقل کی نارسائی کا تو یہ عالم ہے کہ یہ انسان کے اصل مسائل کی تشخیص کرنے ہی سے قاصر ہے چہ جائیکہ وہ ان کا حل پیش کر سکے۔ یہ ایک ایسی آشکار حقیقت ہے کہ تاریخ انسانی کے اوراق اس پر شاہد عدل ہیں۔ لہٰذا ملت اسلامیہ کی فلاح وکامرانی کے لیے خود ساختہ فلسفوں اور اپنی فکر نارسا کے تراشیدہ نظریوں کو اساسِ عمل سمجھنا' خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

رہا یہ سوال کہ افرادِ ملت پر ظلم وستم اور ذلت ورسوائی کے چھائے ہوئے ان مہیب بادلوں کے چھٹنے کی سبیل کیا ہے تو اس کا واضح' دوٹوک اور حتمی جواب صرف یہ ہے کہ ایسا محض اسی صورت میں ممکن ہے جب اس ضابطۂ زندگی کو اپنا لیا جائے جو کسی مخلوق کا وضع کردہ نہیں' بلکہ اسے خالق کون ومکان نے بنی نوع انسان کی ابدی رشد وہدایت اور دائمی فلاح وسعادت کے لیے اس کائنات ارضی میں بھیجا ہے۔ حیاتِ انسانی کا یہ رہبر ورہنما آج اس صحیفۂ ہدایت کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ومصئون موجود ہے جسے ڈیڑھ ہزار برس قبل باری تعالیٰ نے روح القدس کے ذریعے سید الاولین والآخرین ﷺ کے قلب اطہر پر نازل فرمایا تھا اور جسے ہم قرآن حکیم کے نام سے جانتے ہیں۔ یہی صاف' سیدھی اور پختہ راہنمائی کا ضامن ہے اور اپنے

نزول سے تا قیامت قوموں کے عروج و زوال کا واحد معیار ہے۔ جو قوم اسے اپنے نظام زندگی میں رائج اور جاری وساری کر لیتی ہے وہ رفعتوں' بلندیوں اور کامیابیوں کی مستحق ٹھہرتی اور جو اسے پس پشت ڈالتی' نظر انداز کرتی اور اس کی تعلیمات سے روگردانی کی مرتکب ٹھہرتی ہے' عبرتناک ذلت و رسوائی اس کا مقدر بنا دی جاتی ہے۔ ہر صاحبِ عقل وخرد یقیناً اس امر کی تائید کرے گا کہ عصر حاضر میں اُمت مسلمہ کی ڈوبتی ناؤ کو لرزہ خیز اور ہلاکت آفرین طوفانوں سے نکال کر ساحلِ کامرانی سے ہمکنار کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ افرادِ ملت کو قرآن کریم اور اس کی حتمی مراد سنتِ رسول ﷺ سے جوڑ دیا جائے' جو کہ حبل اللہ المتین اور فرد و معاشرے کے ہر ہر مسئلے کا شافی حل ہے۔ اسلامی تاریخ اس بات کی کھلی شہادت دیتی ہے کہ اُمت پر جب بھی کوئی مشکل وقت آیا اور اسے اندرونی یا بیرونی چیلنجز سے سابقہ پیش آیا تو علمائے اُمت اور رہنمایانِ ملت نے اسی قرآن کو بنیاد بنا کر ان چیلنجز کا مقابلہ کیا اور وہ اس میں پوری طرح سرخرو ہوئے۔ لہٰذا آج بھی کرنے کا اصل کام یہی ہے کہ قرآنی حکمت و بصیرت کو اطراف واکناف میں پھیلا دیا جائے تاکہ مطلع ملت پر چھائے ہوئے ظلم و تعدی کے بادلوں کو چیر کر نورِ خدا پوری کائنات کو اپنی ضوفشانیوں سے منور کر دے اور اندھیروں میں بھٹکی ہوئی انسانیت اپنے اصلی مقام' خلد بریں کی طرف عازمِ سفر ہو سکے۔

ان حالات میں وہ لوگ قابل صد مبارک باد ہیں' جنہوں نے اپنی زندگیاں قرآن مجید کے ابلاغ و تبلیغ اور افہام و تفہیم کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ ان پر مبدأ فیض کی یہ خاص نگاہِ تلطف ہے کہ انہیں اشاعت قرآن کے نبویؐ مشن کے لیے منتخب کیا گیا کہ رحمان و رحیم کی یہ کرم گستری بجائے خود باعث افتخار ہے۔ لیکن دعوت الی القرآن پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کی راہ گزر ہے۔ اس لیے کہ جب کلامِ الٰہی کی دعوت افرادِ معاشرہ کو اپنی فطری تأثیر سے اپنی جانب متوجہ کرتی اور خلق خدا اس نشیدِ دل نواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی زندگی کے سانچے اس کے مطابق ڈھالتی ہے تو ابلیس ملعون اور اس کی ذریت اس پکار کی پرزور مزاحمت کرتی ہے۔ چنانچہ جب اپنی خواہشاتِ نفس' اور درحقیقت شیطان کے پجاری اصحاب جبہ و دستار کے مفادات پر زد پڑتی ہے اور انہیں اپنی عظمت و جلال کے محلات مسمار ہوتے دکھائی دیتے ہیں تو وہ داعیانِ قرآن کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں کود پڑتے ہیں۔ مذہبی سطوت و اقتدار کے خداوند اپنی مسانید عظمت وعقیدت کے تحفظ کی خاطر ان لوگوں کے درپے ہو جاتے ہیں جو ان کے فرسودہ افکار و نظریات کی جکڑ بندیوں سے لوگوں کو آزاد کر کے بندگیٔ رب کے قرآنی حکم کی تعمیل کرواتے ہیں۔ مسانید علم وارشاد پر برخود غلط تمکن گزین یہ پروہت و پنڈت جب دلیل و برہان کے میدان میں اپنے آپ کو تہی دامن پاتے ہیں تو گھٹیا ہتھکنڈوں پر اتر آتے ہیں۔ اور تاریخی مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت بے حجابانہ سامنے آئے گی کہ نفس کی پرستش کرنے والے یہ نام نہاد علمبردارانِ مذہب جب کسی داعی قرآن سے بغض و عناد میں اندھے ہو کر بازارِ مخاصمت سرگرم کرتے ہیں تو جس قدر بھیانک جرائم ان گوشوں سے نمودار ہوتے ہیں دنیا کے کسی اور گوشے سے باید و شاید۔

(باقی صفحہ 13 پر)

بقیہ: حرفِ اوّل

لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ وحی الٰہی کی ٹھوس دعوت معاشرے میں پیش کی جائے اور اس کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرلیا جائے۔ سیدنا نوح علیہ السلام سے سیدنا خلیل اللہ d تک اور موسیٰ وعیسیٰ e سے لے کر ختمی المرتبت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ تک ہر ایک کو مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پیروانِ رسولؐ کو بھی اسی طرح کی مخالفتوں اور مخاصمتوں سے واسطہ پڑتا رہا۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ کی مقدس جماعت اور ابوحنیفہؒ وابن حنبلؒ سے ابن تیمیہؒ اور مجدد الف ثانیؒ تک ہر ایک پیروانِ ابلیس کی چیرہ دستیوں اور ستم کوشیوں کا نشانہ بنتا رہا۔ بنابریں موجودہ حالات میں بھی قرآنی پیغام کے ابلاغ میں اگر داعیانِ قرآن پر سب وشتم کیا جائے' ان کے اس چراغِ حیات کو گل کرنے کے منصوبے بنائے جائیں اور بے بنیاد الزام تراشیوں اور شرمناک بہتان طرازیوں سے انہیں مشقِ ستم بنایا جائے' تو انہیں پوری حکمت وبصیرت سے ان کا مقابلہ کرنا ہوگا اور اُسوۂ انبیاء علیہم السلام سے رہنمائی لیتے ہوئے ان معاندوں اور سرکشوں کی تمام تر شرارتوں اور فساد انگیزیوں کو نظر انداز کر کے اپنی نگاہ اسی عظیم ہدف پر مرکوز رکھنا ہوگی جو ان نفوسِ قدسیہ سے انہیں منتقل ہوا ہے کہ اسی پر تسلسل سے کاربند رہنے ہی سے ملت نکبت وزبوں حالی کے اس جہنم سے نکل کر خوشگواریوں اور سرفرازیوں کی جنت سے بہرہ یاب ہو سکے گی اور اسی دعوت الی القرآن سے انسانیت کے ہر گوشے سے حیاتِ نو کے چشمے ابل کر اُمت کی کشتِ اُمید کو سیراب کریں گے۔

اُمت مسلمہ بالعموم اور وطن عزیز بالخصوص اس وقت انتہائی نازک صورت حال میں ہے۔ عالمِ کفر متحد ہو کر جسدِ ملت کو اپنے مہلک چرکوں سے چھلنی کیے جا رہا ہے اور یہ محض مہلتِ خداوندی ہے کہ شرق وغرب کے بدخواہ اپنی بے چین خواہشوں' لگاتار کوششوں اور جاں گسل کاوشوں کے باوجود اپنے مذموم مقاصد کے حصول میں ناکامیوں کا منہ دیکھ رہے ہیں' لیکن اگر اُمت کے اپنے ہی مارِ آستین ان کے آلۂ کار بن کر شجرِ ملت کی شاخوں کو عریاں اور بے برگ وثمر کرنے پر تل جائیں تو ہلاکت وتباہی قوموں کا مقدر بن جایا کرتی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر قسم کی گروہی نسبتوں اور فقہی تعصّبات سے بالاتر رہتے ہوئے باہمی اختلافات کو پس پشت ڈال کر سیسہ پلائی دیوار بن کر مکمل اتحاد واتفاق اور ہم آہنگی ویگانگت سے طاغوتی یلغار کا مقابلہ کیا جائے۔ یہی قرآن کی صدا ہے اور یہی صاحبِ قرآن (ﷺ) کی پکار۔ وما علینا الا البلاغ!

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۂ آل عمران (مسلسل)

آیات ۵۸ تا ۶۰

﴿ذٰلِکَ نَتۡلُوۡهُ عَلَیۡکَ مِنَ الۡاٰیٰتِ وَالذِّکۡرِ الۡحَکِیۡمِ اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰهِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۵۹﴾ اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۶۰﴾﴾

ترکیب :''مِنۡ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے ''اَلذِّکۡرِ الۡحَکِیۡمِ'' مجرور ہے۔''اِنَّ'' کا اسم ''مَثَلَ عِیۡسٰی'' ہے اس لیے اس کا مضاف ''مَثَلَ'' منصوب ہے۔اس کی خبر محذوف ہے۔''کَمَثَلِ اٰدَمَ'' قائم مقام خبر ہے اور ''عِنۡدَ اللّٰهِ'' متعلق خبر ہے۔

ترجمہ:

ذٰلِکَ یہ	نَتۡلُوۡهُ :ہم پڑھ کر سناتے ہیں اسے
عَلَیۡکَ آپؐ کو	مِنَ الۡاٰیٰتِ :آیتوں میں سے
وَالذِّکۡرِ الۡحَکِیۡمِ:اور پُر حکمت نصیحت میں سے	اِنَّ :یقیناً
مَثَلَ عِیۡسٰی :عیسیٰ کی مثال	عِنۡدَ اللّٰهِ :اللہ کے نزدیک
کَمَثَلِ اٰدَمَ: آدم کی مثال جیسی ہے	خَلَقَهٗ :اس نے پیدا کیا انؑ کو
مِنۡ تُرَابٍ :ایک مٹی سے	ثُمَّ :پھر

قَالَ :اس نے کہا — لَـهٗ:انؑ سے

كُنْ :تو ہو جا — فَـيَكُوْنُ: پس وہ ہو گئے

اَلْحَقُّ :حق ہے — مِنْ رَّبِّكَ تیرے ربّ (کی طرف) سے

فَلَا تَـكُنْ: تو آپؐ نہ ہوں — مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ :شک کرنے والوں میں سے

آیات ۶۱ تا ۶۳

﴿فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۞ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۞﴾

ب ھ ل

بَهَلَ (ف) بَهْلاً :کسی کو آزاد چھوڑنا۔

اِبْتَهَلَ (افتعال) اِبْتِهَالًا :اہتمام سے آزاد ہونا' آزادی سے کھل کر التجا کرنا' گڑگڑانا' آیت زیرِ مطالعہ۔

ترکیب :فعل امر ''تَعَالَوْا'' کا جواب امر ہونے کی وجہ سے ''نَدْعُ. نَبْتَهِلْ اور نَجْعَلْ'' مجزوم ہوئے ہیں۔ ''اِنَّ '' کا اسم ''هٰذَا'' ہے۔ ''اِنَّ '' کی خبر پر تاکید مزید کے لیے اکثر لام تاکید لگا دیتے ہیں۔ وہی لام تاکید یہاں ضمیر فاصل ''هُوَ'' پر آیا ہے اور ''اَلْقَصَصُ الْحَقُّ'' خبر معرفہ ہے۔ ''مِنْ اِلٰهٍ'' کا ''مِنْ'' مزید عموم کے لیے ہے۔

ترجمہ:

فَمَنْ : پھر جو — حَآجَّكَ حجت کرے آپؐ سے

فِيْهِ :اس میں — مِنْۢ بَعْدِ مَا :اس کے بعد کہ جو

جَآءَكَ آیا آپؐ کے پاس — مِنَ الْعِلْمِ :علم میں سے

فَقُلْ :تو آپؐ کہیں — تَعَالَوْا :تم لوگ آ ؤ

نَدْعُ :تو ہم پکاریں — اَبْنَآءَنَا :اپنے بیٹوں کو

وَاَبْنَآءَكُمْ :اور (تم) تمہارے بیٹوں کو — وَنِسَآءَنَا :اور (ہم) اپنی عورتوں کو

وَنِسَآءَكُمْ :اور (تم) تمہاری عورتوں کو — وَاَنْفُسَنَا :اور (ہم) اپنی جانوں کو

وَاَنْفُسَكُمْ :اور (تم) تمہاری جانوں کو — ثُمَّ نَبْتَهِلْ: پھر ہم گڑگڑائیں

فَنَجْعَلْ : پھر ہم بنائیں (یعنی بھیجیں)	لَّعْنَتَ اللّٰهِ: اللہ کی لعنت
عَلَى الْكٰذِبِيْنَ : جھوٹ کہنے والوں پر	اِنَّ هٰذَا : بے شک یہ
لَهُوَ : لازماً یہی	الْقَصَصُ الْحَقُّ : سچا قصہ ہے
وَمَا : اور نہیں ہے	مِنْ اِلٰهٍ : کسی قسم کا کوئی الٰہ
اِلَّا اللّٰهُ : سوائے اللہ کے	وَاِنَّ اللّٰهَ : اور یقیناً اللہ
لَهُوَ : لازماً وہی	الْعَزِيْزُ : بالادست ہے
الْحَكِيْمُ : حکمت والا ہے	فَاِنْ : پھر اگر
تَوَلَّوْا : وہ لوگ روگردانی کریں	فَاِنَّ اللّٰهَ : تو یقیناً اللہ (تو)
عَلِيْمٌ : جاننے والا ہے	بِالْمُفْسِدِيْنَ : فساد پھیلانے والوں کو

آیات ۶۴ تا ۶۶

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾

ترکیب : ''كَلِمَةٍ'' نکرہ مخصوصہ ہے اور ''سَوَاءٍ'' اس کی خصوصیت ہے۔ ''اَلَّا'' دراصل ''اَنْ'' اور ''لا'' ہے اور اس میں لائے نفی ہے' اس لیے ''اَنْ'' نے ''نَعْبُدَ'' کو منصوب کیا ہے۔ ''نُشْرِكَ'' اور ''يَتَّخِذَ'' ''اَنْ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ ''يَتَّخِذَ'' کا فاعل ''بَعْضُنَا'' ہے۔ ''بَعْضًا'' اس کا مفعول اوّل اور ''اَرْبَابًا'' مفعول ثانی ہے۔ ''هَا'' کلمۂ تنبیہ ہے۔ ''اَنْتُمْ'' مبتدأ ہے اور ''هٰؤُلَاءِ'' اس کی خبر ہے۔ ''حَاجَجْتُمْ'' خبر کا بدل ہے اس لیے ترجمہ حال میں ہوگا۔ ''لَيْسَ'' کا اسم ''عِلْمٌ'' ہے' اس کی خبر ''مَوْجُوْدًا'' محذوف ہے اور ''لَكُمْ'' قائم مقام خبر مقدم ہے۔

ترجمہ:

قُلْ : آپؐ کہیے	يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ اے اہل کتاب
تَعَالَوْا : تم لوگ آؤ	اِلٰى كَلِمَةٍ : ایک ایسے کلمے کی طرف جو
سَوَآءٍ : یکساں ہے	بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ : ہمارے اور تمہارے درمیان

اَلَّا نَعْبُدَ : کہ ہم بندگی نہ کریں	اِلَّا اللّٰہَ : مگر اللہ کی
وَلَا نُشْرِکَ اور (یہ) کہ ہم شرک نہ کریں	بِہٖ : اس کے ساتھ
شَیْئًا : ذرا سا بھی	وَّلَا یَتَّخِذَ : اور (یہ) کہ نہ بنائے
بَعْضُنَا : ہم میں کا کوئی	بَعْضًا : کسی کو
اَرْبَابًا: (جمع) ربّ : حاکم	مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ : اللہ کے سوا
فَاِنْ : پھر اگر	تَوَلَّوْا : وہ لوگ روگردانی کریں
فَقُوْلُوا : تو تم لوگ کہو	اشْھَدُوْا : گواہ رہو
بِاَنَّا : کہ ہم تو	مُسْلِمُوْنَ: فرماں برداری کرنے والے ہیں
یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ اے اہل کتاب	لِمَ : کیوں
تُحَآجُّوْنَ : تم لوگ حجت کرتے ہو	فِیْ اِبْرٰھِیْمَ : ابراہیمؑ (کے بارے) میں
وَمَآ : حالانکہ نہیں	اُنْزِلَتِ : اتاری گئی
التَّوْرٰىۃُ : تورات	وَالْاِنْجِیْلُ : اور انجیل
اِلَّا مِنْۢ بَعْدِہٖ : مگر انؑ کے بعد	اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: تو کیا تم لوگ عقل نہیں کرتے
ھٰٓاَنْتُمْ: سن لو! تم لوگ	ھٰٓؤُلَآءِ: وہ ہو
حَاجَجْتُمْ : جو حجت کرتے ہو	فِیْمَا : اس میں
لَکُمْ: تمہارے لیے	بِہٖ : جس میں
عِلْمٌ : ایک علم ہے	فَلِمَ : پھر کیوں
تُحَآجُّوْنَ : تم لوگ حجت کرتے ہو	فِیْمَا : اس میں
لَیْسَ: نہیں ہے	لَکُمْ: تمہارے لیے
بِہٖ : جس میں	عِلْمٌ : کوئی علم
وَاللّٰہُ : اور اللہ	یَعْلَمُ : جانتا ہے
وَاَنْتُمْ : اور تم لوگ	لَا تَعْلَمُوْنَ : نہیں جانتے ہو

نوٹ (۱) : کسی اور کو ربّ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت کی جائے۔ (ابن کثیر)

نوٹ (۲) : یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم d یہودی تھے۔ عیسائیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ نصرانی تھے۔ اس حجت کا حوالہ دے کر ان کی توجہ اس حقیقت کی جانب مبذول کرائی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم d کے سینکڑوں سال بعد حضرت موسیٰ d پر تورات نازل ہوئی، جس کے بعد یہودیت وجود میں آئی۔ اور انؑ کے ہزاروں سال بعد حضرت عیسیٰ d پر انجیل نازل ہوئی، جس کے بعد نصرانیت وجود میں آئی۔ پھر

حضرت ابراہیم d یہودی یا نصرانی کیسے ہو گئے؟ تو کیا تمہاری مت بالکل ہی ماری گئی ہے؟

آیات ۶۷ تا ۶۹

﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَدَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝﴾

ترکیب : ''يَهُوْدِيًّا. نَصْرَانِيًّا. حَنِيْفًا اور مُسْلِمًا'' یہ سب ''كَانَ'' کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ ''اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ'' میں ''اَوْلٰى'' تفضیل کل ہے اور یہ پورا فقرہ ''اِنَّ'' کا اسم ہے۔ ''لَلَّذِيْنَ'' کا ''ل'' لام تاکید ہے۔ ''اِنَّ'' کی خبر اوّل ''لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ' ہے۔ ''وَهٰذَا النَّبِيُّ'' خبر ثانی ہے اور ''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' خبر ثالث ہے۔

ترجمہ:

مَا كَانَ : نہیں تھے	اِبْرٰهِيْمُ : ابراہیمؑ
يَهُوْدِيًّا : یہودی	وَّلَا نَصْرَانِيًّا : اور نہ ہی نصرانی
وَّلٰكِنْ : اور لیکن (یعنی بلکہ)	كَانَ : وہ تھے
حَنِيْفًا : یکسو	مُّسْلِمًا : فرماں بردار
وَمَا كَانَ : اور وہ نہیں تھے	مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ : شرک کرنے والوں میں سے
اِنَّ : بے شک	اَوْلَى النَّاسِ : لوگوں میں سب سے زیادہ قریب
بِاِبْرٰهِيْمَ : ابراہیمؑ سے	لَلَّذِيْنَ : لازماً وہ لوگ ہیں جنہوں نے
اتَّبَعُوْهُ : پیروی کی انؑ کی	وَهٰذَا النَّبِيُّ : اور یہ نبی (ﷺ) ہیں
وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ ہیں جو	اٰمَنُوْا : ایمان لائے (ان نبی ﷺ پر)
وَاللّٰهُ : اور اللہ	وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ : مؤمنوں کا کارساز ہے
وَدَّتْ : آرزو کی	طَّاۗىِٕفَةٌ : ایک جماعت نے
مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ : اہل کتاب میں سے	لَوْ : کاش
يُضِلُّوْنَكُمْ : وہ لوگ گمراہ کر دیں تم لوگوں کو	وَمَا يُضِلُّوْنَ : اور وہ گمراہ نہیں کرتے
اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ : مگر اپنے آپ کو	وَ : اس حال میں کہ
مَا يَشْعُرُوْنَ : وہ لوگ شعور نہیں رکھتے	

آیات ۷۰ تا ۷۲

﴿یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ۝ یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝ وَقَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اٰمِنُوۡا بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ عَلَى الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَجۡهَ النَّهَارِ وَاكۡفُرُوۡۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ۝﴾

ترکیب :''اٰمِنُوۡا'' کا مفعول ''بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ'' ہے۔''وَجۡهَ النَّهَارِ''میں ''وَجۡهَ''ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اسی طرح ''اٰخِرَ'' بھی ظرف ہے اور اس کے ساتھ ''ہٗ'' کی ضمیر ''اَلنَّهَارِ'' کے لیے ہے۔''لَعَلَّهُمۡ'' کی ضمیر ''اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا'' کے لیے ہے۔

ترجمہ:

یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ :اے اہل کتاب	لِمَ : کیوں
تَكۡفُرُوۡنَ :تم لوگ انکار کرتے ہو	بِاٰيٰتِ اللّٰهِ :اللہ کی آیتوں کا
وَ : حالانکہ	اَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ :تم لوگ گواہی دیتے ہو
یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ اے اہل کتاب	لِمَ : کیوں
تَلۡبِسُوۡنَ :تم لوگ گڈمڈ کرتے ہو	الۡحَقَّ :حق کو
بِالۡبَاطِلِ :باطل کے ساتھ	وَتَكۡتُمُوۡنَ :اور چھپاتے ہو
الۡحَقَّ :حق کو	وَ : حالانکہ
اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ :تم لوگ جانتے ہو	وَقَالَتۡ :اور کہا
طَّآئِفَةٌ ایک جماعت نے	مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ :اہل کتاب میں سے
اٰمِنُوۡا :تم لوگ ایمان لاؤ	بِالَّذِیۡۤ:اس پر جو
اُنۡزِلَ :اُتارا گیا	عَلَى الَّذِیۡنَ :ان لوگوں پر جو
اٰمَنُوۡا :ایمان لائے	وَجۡهَ النَّهَارِ :دن کے شروع میں
وَاكۡفُرُوۡۤا :اور انکار کرو	اٰخِرَهٗ :اس کے آخر میں
لَعَلَّهُمۡ:شاید وہ لوگ	یَرۡجِعُوۡنَ :لوٹ آئیں

آیات ۷۳، ۷۴

﴿وَلَا تُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّا لِمَنۡ تَبِعَ دِیۡنَكُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنۡ یُّؤۡتٰۤى اَحَدٌ مِّثۡلَ مَاۤ

اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْکُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰہِ ۚ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝ یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝﴾

ترکیب: ''وَلَا تُؤْمِنُوْا'' کا واؤ گزشتہ آیت میں ''وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ'' پر عطف ہے اور ''تُؤْمِنُوْا'' کے بعد ''لِ'' کا صلہ آیا ہے۔ ترجمہ اس کے لحاظ سے ہوگا۔ (دیکھیں البقرۃ: ۵۵ نوٹ ۱)۔ ''اِنَّ'' کا اسم ''اَلْھُدٰی'' ہے اور اس پر لامِ جنس ہے جبکہ ''ھُدَی اللّٰہِ'' خبر ہے اور یہ درمیان میں جملۂ معترضہ ہے۔ ''اَنْ یُّؤْتٰی'' میں ''اَنْ'' پیچھے ''وَلَا تُؤْمِنُوْا'' پر عطف ہے اور ''اَنْ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے آگے ''یُحَاجُّوْا'' منصوب ہوا ہے۔

ترجمہ:

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا : اور (جماعت نے کہا) تم لوگ بات مت مانو	اِلَّا : مگر
لِمَنْ : اس کی جو	تَبِعَ : چلا
دِیْنَکُمْ : تمہارے دین پر	قُلْ : آپؐ کہیے
اِنَّ : یقیناً	الْھُدٰی : اصل ہدایت
ھُدَی اللّٰہِ : اللہ کی ہدایت ہے	اَنْ : (اور نہ مانو) کہ
یُؤْتٰٓی : دیا جائے گا	اَحَدٌ : کسی ایک کو
مِّثْلَ مَآ : اس کے جیسا جو	اُوْتِیْتُمْ : دیا گیا تم کو
اَوْ : یا	یُحَآجُّوْکُمْ : (یہ کہ) وہ لوگ حجت کریں گے تم سے
عِنْدَ رَبِّکُمْ : تمہارے ربّ کے پاس	قُلْ : آپؐ کہیے
اِنَّ : یقیناً	الْفَضْلَ : فضل
بِیَدِ اللّٰہِ : اللہ کے ہاتھ میں ہے	یُؤْتِیْہِ : وہ دیتا ہے اسے
مَنْ : اس کو جسے	یَّشَآءُ : وہ چاہتا ہے
وَاللّٰہُ : اور اللہ	وَاسِعٌ : وسعت والا
عَلِیْمٌ : جاننے والا ہے	یَّخْتَصُّ : وہ مخصوص کرتا ہے
بِرَحْمَتِہٖ : اپنی رحمت سے	مَنْ : اس کو جسے
یَّشَآءُ : وہ چاہتا ہے	وَاللّٰہُ : اور اللہ
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ : بڑے فضل والا ہے	

آیات ۷۵، ۷۶

﴿ وَمِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ ۚ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِدِيۡنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَيۡهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۞ بَلٰى مَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ ۞ ﴾

ترکیب: ''مَا دُمۡتُ'' افعالِ ناقصہ میں سے ہے (دیکھیں البقرۃ: ۷۵، نوٹ ۲)۔ اس کا اسم اس میں شامل ''اَنۡتَ'' کی ضمیر ہے اور ''قَائِمًا'' اس کی خبر ہے۔ ''لَيۡسَ'' کا اسم ''سَبِيۡلٌ'' ہے، خبر محذوف ہے اور ''عَلَيۡنَا'' قائم مقام خبر مقدم ہے۔

ترجمہ:

وَمِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ: اور اہل کتاب میں سے	مَنۡ: وہ بھی ہے جو
اِنۡ: (کہ) اگر	تَاۡمَنۡهُ: تو بھروسہ کرے اس پر
بِقِنۡطَارٍ: ڈھیروں (مال) کا	يُّؤَدِّهٖۤ: تو وہ واپس کرے گا اسے
اِلَيۡكَ: تیری طرف	وَمِنۡهُمۡ: اور ان میں سے
مَّنۡ: وہ بھی ہے جو	اِنۡ: (کہ) اگر
تَاۡمَنۡهُ: تو بھروسہ کرے اس پر	بِدِيۡنَارٍ: ایک دینار کا
لَّا يُؤَدِّهٖۤ: تو وہ واپس نہیں کرے گا اسے	اِلَيۡكَ: تیری طرف
اِلَّا: مگر	مَا دُمۡتَ: جب تک تو رہے
عَلَيۡهِ: اس پر	قَآئِمًا: کھڑا
ذٰلِكَ: یہ	بِاَنَّهُمۡ: اس سبب سے کہ انہوں نے
قَالُوۡا: کہا	لَيۡسَ: نہیں ہے
عَلَيۡنَا: ہم پر	فِى الۡاُمِّيّٖنَ: اُمّی لوگوں (کے بارے) میں
سَبِيۡلٌ: کوئی الزام	وَيَقُوۡلُوۡنَ: اور وہ لوگ کہتے ہیں
عَلَى اللّٰهِ: اللہ پر	الۡكَذِبَ: جھوٹ
وَ: اس حال میں کہ	هُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ: وہ لوگ جانتے ہیں
بَلٰى: کیوں نہیں	مَنۡ: جس نے

اَوۡفٰی :پورا کیا	بِعَهۡدِهٖ :اپنے عہد کو
وَاتَّقٰی :اور تقویٰ اختیار کیا	فَاِنَّ اللّٰهَ :تو یقیناً اللہ
یُحِبُّ :پسند کرتا ہے	الۡمُتَّقِیۡنَ :تقویٰ کرنے والوں کو

بقیہ: حرفِ اوّل

لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ وحی الٰہی کی ٹھوس دعوت معاشرے میں پیش کی جائے اور اس کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرلیا جائے۔ سیدنا نوح علیہ السلام سے سیدنا خلیل اللہ d تک اور موسیٰ وعیسیٰ e سے لے کر ختمی المرتبت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ تک ہر ایک کو مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پیروانِ رسولؐ کو بھی اسی طرح کی مخالفتوں اور مخاصمتوں سے واسطہ پڑتا رہا۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ کی مقدس جماعت اور ابوحنیفہؒ وابن حنبلؒ سے ابن تیمیہؒ اور مجدد الف ثانیؒ تک ہر ایک پیروانِ ابلیس کی چیرہ دستیوں اور ستم کوشیوں کا نشانہ بنتا رہا۔ بنابریں موجودہ حالات میں بھی قرآنی پیغام کے ابلاغ میں اگر داعیانِ قرآن پر سب وشتم کیا جائے' ان کے اس چراغِ حیات کو گل کرنے کے منصوبے بنائے جائیں اور بے بنیاد الزام تراشیوں اور شرمناک بہتان طرازیوں سے انہیں مشقِ ستم بنایا جائے' تو انہیں پوری حکمت وبصیرت سے ان کا مقابلہ کرنا ہوگا اور اُسوۂ انبیاء علیہم السلام سے رہنمائی لیتے ہوئے ان معاندوں اور سرکشوں کی تمام تر شرارتوں اور فساد انگیزیوں کو نظر انداز کرکے اپنی نگاہ اسی عظیم ہدف پر مرکوز رکھنا ہوگی جو ان نفوسِ قدسیہ سے انہیں منتقل ہوا ہے کہ اسی پر تسلسل سے کاربند رہنے ہی سے ملت نکبت وزبوں حالی کے اس جہنم سے نکل کر خوشگواریوں اور سرفرازیوں کی جنت سے بہرہ یاب ہوسکے گی اور اسی دعوت الی القرآن سے انسانیت کے ہر گوشے سے حیاتِ نو کے چشمے ابل کر اُمت کی کشتِ اُمید کو سیراب کریں گے۔

اُمت مسلمہ بالعموم اور وطن عزیز بالخصوص اس وقت انتہائی نازک صورت حال میں ہے۔ عالمِ کفر متحد ہوکر جسدِ ملت کو اپنے مہلک چرکوں سے چھلنی کیے جارہا ہے اور یہ محض مہلتِ خداوندی ہے کہ شرق وغرب کے بدخواہ اپنی بے چین خواہشوں' لگاتار کوششوں اور جاں گسل کاوشوں کے باوجود اپنے مذموم مقاصد کے حصول میں ناکامیوں کا منہ دیکھ رہے ہیں' لیکن اگر اُمت کے اپنے ہی مارِ آستین ان کے آلۂ کار بن کر شجرِ ملت کی شاخوں کو عریاں اور بے برگ وثمر کرنے پر تل جائیں تو ہلاکت وتباہی قوموں کا مقدر بن جایا کرتی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر قسم کی گروہی نسبتوں اور فقہی تعصّبات سے بالاتر رہتے ہوئے باہمی اختلافات کو پس پشت ڈال کر سیسہ پلائی دیوار بن کر مکمل اتحاد واتفاق اور ہم آہنگی ویگانگت سے طاغوتی یلغار کا مقابلہ کیا جائے۔ یہی قرآن کی صدا ہے اور یہی صاحبِ قرآن (ﷺ) کی پکار۔ وما علینا الا البلاغ!

بحث ونظر

اہلِ سنت کا تصورِ ''سنت''

(گزشتہ سے پیوستہ)

حافظ محمد زبیر

۱۔ اس مضمون کی سابقہ قسط میں یعنی سہ ماہی حکمت قرآن اپریل۔ جون ۲۰۰۸ء کے صفحہ ۵۰ پر موجود ایک عبارت ''لیکن اقامت دین کے فرض کی ادائیگی کے لیے سیرت کو بالتفصیل یا جزئی طور پر حجت قرار دینا سوائے غلو فی الدین اور شرعی نصوص کی خلاف ورزی کے اور کچھ نہیں ہے'' کے بارے میں یہ وضاحت کی جارہی ہے کہ اس عبارت میں ''بالتفصیل'' اور ''جزئی'' کے الفاظ مترادف اور minutely کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی سیرتِ نبویؐ کے ہر ہر واقعے کو منہج کے لیے حجت اور لازم قرار دینا درست نہیں ہے، من جملہ سیرت نبویؐ سے رہنمائی لینا شرعاً مطلوب و درست ہے۔
۲۔ اگر کسی صاحب علم کو خیال ہو کہ مضمون کے مندرجات اہل سنت کے موقف کی صحیح عکاسی نہیں کرتے تو اصلاح کی غرض سے لکھے گئے مضامین کے لیے مجلّہ کے صفحات حاضر ہیں۔ (ادارہ)

رسول اللہ ﷺ کے افعال

رسول اللہ ﷺ کے اقوال کی طرح آپؐ کے افعال بھی ہمارے لیے سنت اور مصدرِ تشریع ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

''یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول (ﷺ) میں بہترین اُسوہ موجود ہے''۔

لیکن کیا آپ ﷺ کا ہر ہر فعل ہمارے لیے مصدر، ماخذ اور سنت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی اتباع لازمی یا کم از کم مستحب ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے صرف وہی افعال ہمارے لیے شریعت یا ایسی سنت (جس کی اتباع کرنی چاہیے) کا درجہ رکھتے ہیں جو کہ آپؐ سے بطورِ شریعت صادر ہوئے ہوں۔ ڈاکٹر عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

السنة الفعلية: وهي ما فعله كأداء الصلاة بهيئاتها و أركانها. ومثل قضائها بشاهد واحد ويمين المدعي، ونحو ذلك. وأفعاله منها ما يكون مصدرا

للتشريع، ومنها مالا يكون (١٠٣)

''سنتِ فعلیہ سے مراد وہ عمل ہے جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے کیا ہو، جیسا کہ آپؐ نے نماز کو مختلف ارکان اور شکلوں کے ساتھ ادا کیا ہے۔ اسی طرح آپؐ نے ایک گواہ اور مدعی کی قسم کے ساتھ فیصلہ کیا ہے اور اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں۔ آپ ﷺ کے بعض افعال ہمارے لیے شریعت ہیں جبکہ بعض شریعت نہیں ہیں''۔

ڈاکٹر حمزہ الملیباری لکھتے ہیں:

السنة فی الاصطلاح ما هو عن رسول الله ﷺ علی وجه التشریع من قول أو فعل أو تقریر أو صفة خلقیة من مبدأ بعثته إلی وفاته(١٠٤)

''اصطلاح میں سنت سے مراد ہر وہ قول یا فعل یا تقریر یا اکتسابی وصف ہے جو رسول اللہ ﷺ سے آپ کی بعثت کے بعد سے لے کر وفات تک کے دورانیے میں بطورِ شریعت صادر ہوا ہو''۔

خود اس آیت میں بھی اس بات کا قرینہ موجود ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ہر فعل ہمارے لیے اُسوہ نہیں ہے۔ آیت مبارکہ میں ﴿فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ﴾ کے الفاظ ہیں، یعنی اللہ کے رسول ﷺ میں یا ان کے افعال میں یا ان کی زندگی میں یا ان کے طریقے میں تمہارے لیے اُسوہ ہے۔ عربی زبان میں 'فی' کا لفظ عموماً ظرفیت کا معنی دیتا ہے۔ بعض اوقات یہ ظرفیت حقیقی ہوتی ہے، مثلاً ﴿غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ﴾ اور بعض اوقات مجازی ہوتی ہے، جیسا کہ ﴿فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ﴾ میں ہے۔ اگر آیت کا اسلوب یوں ہوتا کہ اللہ کے رسول ﷺ تمہارے لیے اُسوہ ہیں تو پھر یہ معنی مراد ہو سکتے تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے جمیع افعال میں اتباع مطلوب و مقصود ہے۔ امام ابن حزمؒ نے ''الاحکام'' میں اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اتباعِ رسول ﷺ کا معنی و مفہوم اور شرعی حکم

حال ہی میں یہ فلسفہ متعارف ہوا ہے جس کا ذکر ہم سابقہ قسط میں بھی کر چکے ہیں، کہ اللہ کے رسول ﷺ کے ہر ہر فعل کی پیروی اس اتباع میں شامل ہے جس کا قرآن میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے، لہٰذا اگر اللہ کے رسول ﷺ نے تہبند باندھا ہے تو ہمیں بھی تہبند باندھنا چاہیے۔ آپ ﷺ نے عمامہ باندھا، موزے پہنے، اونٹ، گھوڑے اور گدھے کی سواری کی، ثرید کھائی، سرمہ لگایا وغیرہ، تو ہمیں بھی یہ سب کام کرنے چاہئیں اور ان سب کو کرنا آپؐ کی اتباع اور باعث ثواب و بلندیٔ درجات ہے۔ یہ حضرات آپ ﷺ کے ہر ہر فعل کو سنت کا نام دیتے ہیں اور سنت کی پیروی میں اس حد تک غلو اختیار کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک زمین پر بیٹھنا سنت اور کرسی پر بیٹھنا خلافِ سنت ہے۔ اور چونکہ ان کے بقول ہر سنت طیب ہے اور ہر خلافِ سنت کام ان کے نزدیک خبیث ہے، لہٰذا کرسی پر بیٹھنا خباثت ہے۔ اسی طرح ان کے فلسفۂ سنت کی رو سے کراچی سے لاہور جانے کے لیے اونٹ کی سواری، گاڑی کی سواری سے افضل ہے۔ وہ اس

پر بھی مصر ہیں کہ ہاتھ سے کھانا سنت ہے اور چمچ سے کھانا خباثت ہے' عمامہ اور تہبند باندھنا ہی سنت' باعث ثواب اور بلندیٔ درجات کا سبب ہے' وغیر ذٰلك۔ ان میں سے بعض حضرات نے تو اِس درجہ غلو اختیار کیا کہ قرآن کی طباعت' پاروں اور رکوعوں کی تقسیم' قرآن کے اعراب وحرکات تک کو یہودی سازش قرار دیا ہے کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے یہ کام نہ کیا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ نقطہ نظر بوجوہ باطل افکار پر مشتمل ہے۔ اس کے قائلین اپنی جہالت کے باعث تلبیس ابلیس کا شکار ہیں اور ایک ایسی چیز کو دین قرار دے رہے ہیں جس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ''دین'' قرار نہیں دیا ہے۔ لہٰذا یہ لوگ اہل بدعت ہیں اور سنت کا ایسا من گھڑت تصور پیش کر رہے ہیں جو اُمت مسلمہ کی چودہ سو سال کی تاریخ میں پیش نہیں ہوا۔ ہاں اس بات سے انکار نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص ان افعال کو رسول اللہ ﷺ سے محبت اور تعلق کے اظہار کی نیت سے ادا کرتا ہے تو ان شاء اللہ العزیز اس نیت وارادہ کے ثواب کا مستحق ٹھہرے گا۔ ذیل میں ہم اس گروہ کے افکار کا ایک علمی اور تحقیقی جائزہ لے رہے ہیں۔ قرآن مجید میں ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (آل عمران)

''(اے نبی ﷺ!) آپ ان سے کہہ دیں کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا' اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

اتباع کے لفظ کا مادہ 'تبع' ہے۔ 'لسان العرب' میں ہے کہ معروف لغوی فراء نے اتباع کا معنی ''ان یسر الرجل و أنت تسیر وراءہ'' بیان کیا ہے۔ یعنی کوئی شخص چلے اور تم اس کے پیچھے چلو تو یہ اس کی اتباع ہے۔ پس اتباع کے لغوی معنی پیروی کرنے اور پیچھے چلنے کے ہیں۔

اس آیت کا سیاق وسباق یہ بتلا رہا ہے کہ کچھ لوگوں نے عہد نبوی میں اللہ سے محبت کا دعویٰ کیا تو اُن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ جمہور مفسرین کا کہنا یہ ہے کہ یہ آیت مبارکہ نجران کے اس عیسائی وفد کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو اللہ سے محبت کے دعوے دار تھے لیکن اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی بات ماننے سے انکاری تھے۔ اس آیت مبارکہ کے شانِ نزول کے بارے میں چار اقوال مروی ہیں' جن کا تذکرہ علامہ ابن جوزیؒ نے اپنی تفسیر 'زاد المسیر' میں کیا ہے۔ یہ اقوال درج ذیل ہیں:

(۱) یہ آیتِ مبارکہ ان مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو اللہ سے محبت کے دعوے دار تھے' جیسا کہ قرآن نے آیت مبارکہ ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ (الزمر:۳) میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی مشرکین کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ اللہ کے غیر کی عبادت بھی اللہ کے قرب کے حصول کے لیے کرتے تھے۔ یہ قول ضحاکؒ نے حضرت عبداللہ بن عباس i سے بیان کیا ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت مبارکہ نجران کے اس عیسائی وفد کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو اللہ سے محبت کے دعوے دار تھے۔ یہ قول مفسرین کی ایک جماعت کا ہے۔ امام المفسرین ابن جریر طبریؒ کی

بھی یہی رائے ہے۔امام قرطبیؒ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔

(۳) مفسرین کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت مبارکہ ان یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۤؤُهٗ﴾(المائدۃ:۱۸) کا دعویٰ کیا تھا۔امام رازیؒ، علامہ مجد الدین فیروز آبادیؒ، علامہ سمرقندیؒ اور امام بغویؒ نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔بعض مفسرین نے دوسرے اور تیسرے دونوں اقوال کو اس آیت مبارکہ کا شان نزول قرار دیا ہے۔یعنی ان مفسرین کے نزدیک یہ آیت مبارکہ اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔اس رائے کے حاملین میں امام ابن عطیہؒ، امام خازنؒ اور امام ابوحیان الاندلسیؒ وغیرہ شامل ہیں۔

(۴) ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ آیت مبارکہ ایک ایسی قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اللہ سے محبت کی دعوے دار تھی۔یہ قوم کون تھی، اس کا تعین اس قول میں موجود نہیں ہے۔یہ رائے حضرت حسن بصریؒ کی ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت مبارکہ کو اس کے شانِ نزول سے خاص کرنے کی بجائے اسے عام رکھا ہے۔مثلاً امام ابن کثیرؒ اور امام نسفیؒ وغیرہ۔صحیح بات بھی یہی ہے کہ آیت اگرچہ اپنے نزول کے اعتبار سے خاص ہے لیکن اس کا معنی عام ہے، جیسا کہ مفسرین کا قاعدہ ہے ''**العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب**''، یعنی کسی آیت کی تفسیر میں شانِ نزول کے اعتبار کی بجائے اس آیت کے الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوگا۔شانِ نزول سے کوئی آیت مبارکہ کسی فرد یا ایک جماعت کے ساتھ خاص تو نہیں ہو جاتی لیکن پھر بھی آیت کے معنی و مفہوم کو سمجھنے میں شانِ نزول کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

اتباع کا لفظ قرآن میں معمولی فرق کے ساتھ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔قرآن میں یہ لفظ پیچھے چلنے اور پیروی کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ﴾(الحجر:۶۵) اور: ﴿لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ﴾(التوبۃ:۴۲) اور: ﴿ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ﴾(الفتح:۱۵) اور: ﴿قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ﴾(آل عمران:۱۶۷) اور: ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾(القیٰمۃ)۔

عام طور پر اطاعت اور اتباع کا فرق بیان کرنے کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اطاعت حکم کی ہوتی ہے اور اتباع حکم کے بغیر ہوتی ہے، حالانکہ بعض اوقات اتباع کا لفظ قرآن میں کسی کا حکم ماننے اور اس حکم کی پیروی کرنے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ﴾(ھود:۹۷) اور ﴿وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ﴾(ھود) ہے۔ان آیات میں مصدر کا صیغہ 'امر' بمعنی اسم مفعول یعنی 'مامور' ہے اور مصدر کا اسم مفعول کے معنی میں استعمال قرآن میں عام ہے۔لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ اتباع کا لفظ اس معنی میں عام ہے کہ اگر کسی کے حکم پر عمل کیا جائے تو یہ بھی اتباع ہے اور اگر کسی کے حکم کے بغیر اس کے نقش قدم پر چلا جائے تو یہ بھی اتباع ہے۔

اتباع کا یہ معنی تو لغت سے واضح ہے کہ کسی کے پیچھے چلنا' لیکن کیا اتباع کے معنی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جہاں کوئی دایاں پاؤں رکھے بعینہٖ اُس جگہ اُس کے پیچھے چلتے ہوئے دایاں پاؤں رکھا جائے اور جہاں کسی کا بایاں پاؤں زمین پر پڑے عین اسی جگہ اپنا بایاں پاؤں ہی رکھا جائے؟ اہل لغت میں سے کسی نے بھی اتباع کا یہ مفہوم بیان نہیں کیا ہے۔ قرآن میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جن سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہﷺ کی اتباع سے ہر ہر فعل میں آپؐ کی پیروی مراد نہیں ہے۔ مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَآاَيُّـهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الانفال)

''اے نبی (ﷺ!) اللہ تعالیٰ آپ کے لیے بھی اور اہل ایمان میں سے جنہوں نے آپ کی اتباع کی' ان کے لیے بھی کفایت کرنے والا ہے''۔

اگر اتباع سے مراد یہ لی جائے کہ اللہ کے رسولﷺ کے جبلی افعال مثلاً آپ کا کھانا' پینا' اٹھنا اور بیٹھنا وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں تو اکثر صحابہ j تو آپﷺ کے جبلی افعال میں آپ کی پیروی نہیں کرتے تھے' تو کیا ان صحابہؓ کو اللہ کی ذات کفایت کرنے والی نہیں ہے؟

صحابہ کرام j میں سب سے زیادہ حضرت عبداللہ بن عمر i کے بارے میں روایات میں ملتا ہے کہ وہ اللہ کے رسولﷺ کے ہر ہر فعل کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حج یا عمرہ کے دوران اگر کسی جگہ سے اللہ کے رسولﷺ کا گزر ہوا ہوتا تھا تو وہ بھی اسی جگہ سے گزرنے کی کوشش کرتے تھے اور آپﷺ اگر کسی جگہ راستے میں قضائے حاجت کے لیے بیٹھے تھے تو وہ بھی اسی جگہ قضائے حاجت کا اہتمام کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے علاوہ باقی جلیل القدر صحابہؓ آپؐ کی اس درجے پیروی نہیں کرتے تھے۔ اگر تو حضرت عبداللہ بن عمر i کا آپؐ کی پیروی میں حد درجے آگے بڑھ جانا اتباع کے مفہوم میں شامل ہے تو پھر ﴿فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ صحابہ کی اکثریت اللہ کے رسولﷺ کی اتباع کرنے والی نہیں تھی اور نہ ہی اللہ کی محبوب تھی۔ کیونکہ تمام صحابہؓ آپؐ کے ہر ہر عمل میں آپؐ کی پیروی نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولﷺ کو حکم دیا:

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الشُّعراء)

''اور (اے نبیﷺ!) آپؐ اپنے دونوں بازو اِن اہل ایمان کے لیے پست رکھیں جنہوں نے آپؐ کی اتباع کی''۔

اس آیت کے نزول کے بعد کیا رسول اللہﷺ کے بازو صرف حضرت عبداللہ بن عمر i کے لیے پست رہے یا جمیع صحابہؓ کے لیے؟ جواب بالکل واضح ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد آپﷺ تمام صحابہؓ کے ساتھ نرمی اختیار کرتے تھے' جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اتباع سے مراد جمہور صحابہ j کا طرزِ عمل ہے نہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ کا۔ کیونکہ اگر اتباع سے مراد حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا طرز عمل لیا جائے تو پھر گویا جمہور صحابہؓ نے آپﷺ کی اتباع نہ کی اور آپؐ نے بھی (معاذ اللہ!) جمہور صحابہؓ کے ساتھ نرمی کا

رویہ اختیار کر کے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔

اگر اتباع سے جمیع افعال میں آپ ﷺ کی پیروی مراد لی جائے تو یہ اتباع کسی ایک صحابیؓ نے بھی نہیں کی ہے، حتیٰ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی بعض معاملات میں آپؐ کے بعض افعال کی خلاف ورزی مروی ہے۔ جیسا کہ ہم صحیح بخاری کی ایک روایت بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حج یا عمرہ کے موقع پر اپنی داڑھی اپنی مٹھی میں لے کر زائد بال کاٹ دیتے تھے، جبکہ اللہ کے رسول ﷺ سے زندگی بھر ایسا ثابت نہیں ہے۔

قرآن مجید میں حق اور باطل دونوں کی پیروی کے لیے اتباع کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ پہلی قسم کی مثالیں ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾(الانعام:۱۵۳) اور ﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ﴾(الانعام:۱۵۵) اور ﴿اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ﴾(یونس:۱۵) اور ﴿اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا﴾(النحل:۱۲۳) اور ﴿فَاتَّبِعُوْنِیْ وَاَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ ●﴾(طٰہٰ) اور ﴿وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ﴾(لقمٰن:۱۵) اور ﴿یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ❑﴾(مریم) اور ﴿الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾(التوبۃ:۱۱۷) اور ﴿اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ﴾(آل عمران:۶۸) اور ﴿فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا﴾(آل عمران:۹۵) اور ﴿وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا﴾(آل عمران:۵۵) اور ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾(الشُّعراء) وغیرہ شامل ہیں۔ ان آیات میں اتباع کا لفظ سیدھے راستے کی پیروی، وحی الٰہی کی پیروی، نبیؐ کی پیروی، قرآن کی پیروی وغیرہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سیدھے راستے کی پیروی سے مراد دینِ اسلام کی پیروی یعنی اس پر عمل ہے اور قرآن کی پیروی سے مراد قرآن پر عمل کرنا ہے۔ قرآن میں بہت سے مقامات پر اتباع کا لفظ باطل خواہشات ونظریات اور شیطان کی پیروی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ﴾(الاعراف:۱۷۶) اور ﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ﴾(المائدۃ:۴۸) اور ﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا﴾(الانعام:۱۵۰) اور ﴿وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ﴾(مریم:۵۹) اور ﴿وَمَا یَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا﴾(یونس:۳۶) اور ﴿اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ﴾(الانعام:۱۱۶) اور ﴿وَیَتَّبِعُ كُلَّ شَیْطٰنٍ مَّرِیْدٍ ۙ﴾(الحج) وغیرہ ہے۔

لہٰذا قرآن کے استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبیؐ کی اتباع سے مراد اپنی خواہش نفس و شیطان کے بالمقابل نبیؐ کی وحی الٰہی پر مبنی بات مانتے ہوئے اس کے پیچھے چلنا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم d نے اپنے باپ کو شیطان کی عبادت کے بالمقابل اپنی پیروی کی تبلیغ کی۔ اسی طرح حضرت ہارون d نے بھی اپنی قوم کو بچھڑے کی پرستش میں خواہش نفس کے پیچھے چلنے کی بجائے اپنی اتباع کا حکم دیا۔ علاوہ ازیں مذکورہ بالا آیات میں خواہش نفس، شیطان اور گمان وغیرہ کی پیروی کو مذموم قرار دیا گیا ہے اور اس کے بالمقابل دین اسلام، وحی الٰہی اور نبیؐ کی اتباع کا حکم جاری کیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کو حضرت ابراہیمؑ کے طریقے کی

اتباع کا جو حکم دیا گیا ہے یا مسلمانوں کے بارے میں یہ خبر دی گئی ہے کہ وہ حضرت ابراہیم d کے زیادہ قریب ہیں' کیونکہ انہوں نے ان کی اتباع کی ہے یا مسلمانوں کو بھی قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کی اتباع کا جو حکم دیا گیا ہے' تو اس سے کیا حضرت ابراہیمؑ کے ہر ہر فعل کی پیروی مراد ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے' کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کا ہر ہر طریقہ نہ تو کسی آسمانی کتاب میں محفوظ ہے' نہ ہی آپ ﷺ کو وحی کیا گیا ہے اور نہ ہی حضرت ابراہیمؑ کی شریعت ہمارے لیے بھی شریعت ہے۔ اس سے مراد بعض مخصوص معاملات مثلاً شرک سے اجتناب وغیرہ میں حضرت ابراہیمؑ کی پیروی ہے۔ قرآن کی آیت ﴿اَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾ (التوبۃ:۱۱۷) بھی اس بات کی دلیل ہے کہ بعض اوقات اتباع کا لفظ ایک محدود دائرے میں کسی کے پیچھے چلنے کے معنی میں بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کے لیے ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ (البقرۃ:۱۴۳) میں بھی اتباع سے مراد ذاتی خواہش کے بالمقابل رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنا ہے۔ خود اللہ کے رسول ﷺ کے لیے اتباع کا لفظ وحی اور سابقہ انبیاء f کی پیروی کے لیے استعمال ہوا ہے' جیسا کہ اللہ کا فرمان ﴿اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ﴾ اور ﴿اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰى اِلَيَّ﴾ (الاعراف:۲۰۳) اور ﴿اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا﴾ ہے۔

جس طرح اتباع سے مراد ہر ہر فعل کی پیروی نہیں ہے' اسی طرح یہ بات کہنا کہ اتباع میں محبت شامل ہے' یا یہ کہ اطاعت اور اتباع میں اصل فرق یہ ہے کہ اطاعت بغیر محبت کے ہوتی ہے اور اتباع محبت کے ساتھ اطاعت کا نام ہے' یہ بھی پورے طور پر درست معلوم نہیں ہوتی۔ ہاں' اس بات سے انکار نہیں ہے کہ اتباع و اطاعت کا کمال بغیر محبت کے حاصل نہیں ہو سکتا' لیکن انہیں محبت سے مشروط کرنے کے لیے دلیل درکار ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اہل لغت میں سے کسی ایک نے بھی اتباع کے مفہوم میں یہ بات بیان نہیں کی ہے کہ اتباع سے مراد محبت یا دلی آمادگی کے ساتھ کسی کی اطاعت کرنا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن نے اتباع کو جن معانی میں استعمال کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اتباع کے لیے ضروری نہیں ہے کہ محبت بھی اس میں شامل ہو' جیسا کہ ارشاداتِ باری تعالیٰ ﴿قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ﴾ (آل عمران:۱۶۷) اور ﴿ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ﴾ (الفتح:۱۵) اور ﴿فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْا اَمْرِيْ ●﴾ (طٰہٰ) اور ﴿وَيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۙ﴾ (الحج) وغیرہ ہیں۔ پہلی دونوں آیات منافقین کے بارے میں ہیں اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ان کی اتباع کبھی بھی محبت کے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ تیسری آیت میں حضرت ہارونؑ بچھڑے کے پجاریوں سے اپنی اتباع کا مطالبہ کر رہے ہیں اور کلام کا سیاق و سباق مثلاً ﴿وَاَطِيْعُوْا اَمْرِيْ﴾ کے الفاظ بتلا رہے ہیں کہ یہاں حضرت ہارونؑ کی اپنی اتباع سے مراد صرف یہ ہے کہ شرک چھوڑ دو' چاہے اس کو چھوڑنے کے لیے تمہارے دل آمادہ ہیں یا نہیں۔ چوتھی آیت میں شیطان کی اتباع کی بات ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ شیطان کی اتباع محبت کے ساتھ ہوتی ہو۔ تیسری

بات یہ ہے کہ جب اہل لغت نے اتباع کے معنی میں محبت کو لازماً شامل نہیں کیا ہے تو اس بات کی کوئی شرعی دلیل ہونی چاہیے کہ اتباع کے معنی میں محبت کا مفہوم بھی شامل ہے تاکہ یہ دعویٰ ممکن ہو کہ اتباع کا ایک لغوی مفہوم ہے اور ایک شرعی معنی ہے۔ قرآن میں اتباع کا مطالبہ مسلمانوں اور کفار دونوں سے ہے۔ کفار کے لیے اس کی مثال حضرت ابراہیم d کا اپنے باپ کو ﴿فَاتَّبِعۡنِیۤ اَهۡدِکَ صِرَاطًا سَوِیًّا﴾ (مریم) کے ذریعے اپنی اتباع کا حکم دینا ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ﴿قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ﴾ (آل عمران: ۳۱) میں اصلاً خطاب ان مشرکین اور اہل کتاب سے ہے جو کہ اللہ سے محبت کے دعویدار تھے یا اب بھی ہیں۔ ان کفار کو اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اس اتباع سے مراد آپؐ پر ایمان لانے کے مطالبے میں آپؐ کی بات کی پیروی کرنا ہے۔ تبعاً اس آیت کے عمومی مفہوم میں تمام مسلمانوں سے بھی اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع کا مطالبہ ہے اور اس اتباع سے مراد آپؐ کے ان اقوال و افعال اور تقریر و تصویب کی پیروی کرنا ہے جو کہ آپ ﷺ سے بطورِ دین و شریعت صادر ہوئے ہوں نہ کہ آپؐ کے ہر ہر قول اور فعل کی پیروی کرنا' کیونکہ صحابہؓ نے آپ ﷺ کے ہر ہر قول اور فعل کی پیروی نہیں کی ہے۔

افعالِ رسول ﷺ کی درجہ بندی

نبی مکرم ﷺ کے افعال کو اہل علم نے مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے' جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) جبلی اور اتفاقی امور

اللہ کے رسول ﷺ کے جبلی اور اتفاقی امور اُمت کے لیے نہ تو شریعت ہیں اور نہ ہی ایسی سنت ہیں جن کی اتباع باعث ثواب ہے۔ جبلی امور سے مراد وہ کام ہیں جو ایک انسان اپنے جبلی تقاضوں کے تحت سرانجام دیتا ہے' مثلاً ایک انسان کھانا کھاتا ہے' پانی پیتا ہے' سوتا ہے' اُٹھتا ہے' بیٹھتا ہے' پیشاب پاخانہ کرتا ہے' لباس پہنتا ہے' جوتا پہنتا ہے' اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام امور ایسے ہیں کہ ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے' یعنی اگر کوئی شخص مسلمان نہ بھی ہو تو پھر بھی وہ اپنی جبلت کے تقاضوں کے تحت یہ سب کام کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک مسلمان نماز پڑھتا ہے' روزہ رکھتا ہے' حج ادا کرتا ہے' زکوٰۃ دیتا ہے' وغیرہ تو یہ افعال جبلی نہیں ہیں' کیونکہ عام انسان یہ کام نہیں کرتے۔ آپ ﷺ کے جبلی افعال سے کم از کم یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام حرام نہیں ہیں' کیونکہ آپؐ سے حرام کا ارتکاب ناممکن ہے۔ ڈاکٹر عبدالکریم زیدانؒ لکھتے ہیں:

أفعاله الجبلية أی التی تصدر منه بحب الطبيعة البشرية و بصفته انسانا: كالأكل' والشرب' والمشی' والقعود' ونحو ذلک' فهذه لا تدخل فی باب التشريع إلا علی اعتبار إباحتها فی حق المكلفين' فلا تجب متابعة الرسول فی طريقة

مباشرته لها' وإن كان بعض الصحابة يحرص على هذه المتابعة كعبد الله بن عمر' وهذه المتابعة أمر حسن. (۱۰۵)

''اللہ کے رسول ﷺ کے جبلی افعال جو کہ ایک انسان ہونے اور بشری تقاضوں کے تحت آپؐ سے صادر ہوئے تھے' مثلاً کھانا' پینا' چلنا' بیٹھنا وغیرہ تو یہ تشریع کے باب میں نہیں ہیں' سوائے اس کے کہ یہ مکلفین کے لیے مباحات کا دائرہ ہے۔ان افعال میں آپؐ کے طریقے کی پیروی لازمی نہیں ہے' اگرچہ بعض صحابہؓ اس متابعت کے بہت زیادہ حریص تھے اور ایسی متابعت ایک اچھی چیز ہے''۔

لہٰذا آپ ﷺ کے جبلی افعال مباح کے درجے میں ہیں' یعنی ان کے کرنے اور نہ کرنے دونوں کا کوئی ثواب نہیں ہے۔علماء نے مباح کی یہی تعریف بیان کی ہے' جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔علامہ آمدیؒ لکھتے ہیں:

فنقول أما ما كان من الأفعال الجبلية كالقيام و القعود و الأكل و الشرب و نحوه فلا نزاع في كونه على الإباحة بالنسبة اليه و إلى أمته(۱۰۶)

''پس ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ کے جبلی افعال مثلاً کھانا' پینا' اٹھنا' بیٹھنا وغیرہ میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے کہ یہ افعال آپ ﷺ کے لیے اور آپؐ کی امت کے لیے مباح ہیں''۔

مباح کے بارے میں ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ بعض علماء کے نزدیک بعض مباحات ایسے ہو سکتے ہیں کہ ان کی ادائیگی پر ایک مسلمان کو اس کی نیت و ارادے کا ثواب ملے' جیسا کہ ڈاکٹر عبدالکریم زیدانؒ لکھتے ہیں:

وإن حكم المباح : أنه لا ثواب فيه ولا عقاب' ولكن قد يثاب عليه بالنية والقصد' كمن يمارس أنواع الرياضية البدنية بنية تقوية جسمه' ليقوى على محاربة الأعداء(۱۰۷)

''مباح کا حکم یہ ہے کہ اس کے کرنے میں نہ تو ثواب ہے اور نہ ہی عذاب ہے۔لیکن بعض مباحات ایسے ہیں کہ ان کے کرنے پر بعض اوقات نیت و ارادے کا ثواب ہوتا ہے' جیسے کوئی شخص ورزش کرتا ہے تا کہ اس کا جسم قوی ہو اور وہ اللہ کے دشمنوں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکے (یعنی جہاد کر سکے)''۔

لہٰذا اگر کوئی شخص ان افعال کو رسول اللہ ﷺ سے محبت اور تعلق کے اظہار کی نیت سے ادا کرتا ہے تو پھر اس نیت و ارادے پر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھی جا سکتی ہے۔اُمید کی بات اس لیے کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے جبلی و اتفاقی افعال کو شریعت نہیں بنایا اور نہ ہی کسی نص میں آپ ﷺ کے جبلی و اتفاقی افعال کی اتباع کا حکم دیا ہے اور نہ ہی ان افعال کی اتباع پر ثواب کا کوئی وعدہ کیا ہے۔اس لیے یقینی طور پر یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ان افعال کی اتباع پر ثواب دیں گے' ایک دعویٰ ہے جس کے لیے کوئی دلیل چاہیے۔اس کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت امامہ بنت زینبؓ کو اپنی گردن پر بٹھا کر جماعت کروائی اور یہ ایک اتفاقی امر تھا۔اب اگر کوئی امام صاحب آپ ﷺ کی محبت میں آپؐ کی اقتداء

کرتے ہوئے ایسا کرتے ہیں تو کیا انہیں اس عمل کا ثواب بھی ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ یہی بات کی جاسکتی ہے کہ امام صاحب کے اس عمل پر ان کو اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ تعلق کے اظہار کے جذبے پر ثواب ملنے کی امید ہے۔ اس عمل میں آپؐ کی اقتداء پر ثواب اگر ایک یقینی امر ہوتا تو سب صحابہؓ یہ کام کرتے، کیونکہ وہ نیکیوں کے معاملے میں بہت حریص تھے، لیکن کسی ایک بھی صحابیؓ کے بارے میں مروی نہیں ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں اس فعل کو سنت سمجھتے ہوئے کیا ہو۔ امام مسلمؒ جب اس روایت کو اپنی صحیح میں لائے ہیں تو امام نوویؒ نے اس پر ''جواز حمل الصبیان فی الصلاۃ'' کے عنوان سے باب باندھا ہے۔ یعنی اس حدیث سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں یہ فعل جائز ہے۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ گدھے پر سوار ہوئے اور یہ ایک اتفاقی امر تھا، اگر گدھے پر سواری سنت ہوتی یا اس پر سواری کرنے میں ثواب ایک یقینی امر ہوتا تو تمام صحابہؓ یہ کام کرتے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ آپ ﷺ کے اتفاقی افعال بجائے خود اور اُن میں آپ کی پیروی یقینی طور پر اجر و ثواب کا موجب ہے تو ایسا شخص بدعتی ہے۔ امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

وکذلک ابن عمر کان یتحری أن یسیر مواضع سیر النبی ﷺ و ینزل مواضع منزلہ، ویتوضأ فی السفر حیث رآہ یتوضأ، و یصب فضل مائہ علی شجرۃ صب علیھا، ونحو ذلک مما استحبہ طائفۃ من العلماء ورأوہ مستحبا، و لم یستحب ذلک جمھور العلماء، کما لم یستحبہ و لم یفعلہ أکابر الصحابۃ کأبی بکر و عمر و عثمان و علی وابن مسعود و معاذ بن جبل و غیرھم لم یفعلوا مثل ما فعل ابن عمر، و لو رأوہ مستحبا لفعلوہ کما کانوا یتحرون متابعتہ و الاقتداء بہ[۱۰۸]

''اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ جہاں سے اللہ کے رسول ﷺ کا گزر ہوا ہے وہاں سے گزریں اور جہاں اللہ کے رسول ﷺ نے قیام کیا وہ بھی وہاں قیام کریں اور جہاں اللہ کے رسول ﷺ نے وضو کیا وہ بھی وہاں وضو کریں اور جس درخت پر اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے وضو کا باقی ماندہ پانی ڈالا وہ بھی اسی درخت پر اپنے وضو کا باقی ماندہ پانی ڈالیں۔ اس کے علاوہ اور بھی آپ ﷺ کے ایسے افعال ہیں کہ جن کو علماء کی ایک جماعت نے مستحب قرار دیا ہے، لیکن جمہور علماء کے نزدیک آپ ﷺ کے یہ افعال مستحب نہیں ہیں اور نہ ہی اکابر صحابہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت معاذ بن جبل j وغیرہ نے ان کو مستحب سمجھا ہے اور نہ ہی ان اکابر صحابہؓ نے ایسا کیا ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر i کرتے تھے۔ اگر یہ اکابر صحابہ آپ ﷺ کے ان افعال کو مستحب سمجھتے تو وہ لازماً ان کو کرتے، کیونکہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کی اقتداء اور متابعت کے لیے حد درجہ کوشش کرتے تھے (یعنی ان افعال میں آپ ﷺ کی پیروی اکابر صحابہؓ کے نزدیک آپ ﷺ کی متابعت اور اقتداء کے مفہوم میں شامل نہیں تھی)''۔

امام صاحبؒ کی اس عبارت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ کے رسول ﷺ کے اتفاقی امور میں آپؐ کی پیروی کرنا باعث ثواب نہیں ہے' کیونکہ اگر یہ باعث ثواب ہوتا تو اکابر صحابہؓ بھی ایسا کرتے۔امام ابن تیمیہؒ کی طرح امام زرکشیؒ نے 'البحر المحیط' میں لکھا ہے کہ جمہور علماء کا یہی موقف ہے اور اصول فقہ کی کتابوں میں بھی معروف مذہب کے طور پر یہی موقف بیان ہوا ہے کہ آپ ﷺ کے وہ افعال جن کا جبلی ہونا واضح ہو' مباح ہیں۔امام شوکانیؒ نے بھی 'ارشاد الفحول' میں اسے ہی جمہور کا مذہب قرار دیا ہے۔علامہ آمدیؒ کے 'الاحکام' میں اس موضوع پر بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں علماء کا یہی ایک موقف ہے کہ آپ ﷺ کے جبلی افعال مباح ہیں۔البتہ قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے کہ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک یہ افعال مستحب ہیں' جیسا کہ ابن تیمیہؒ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے' لیکن علماء کی اس جماعت کے نام اصول کی کتابوں میں منقول نہیں ہیں' لہٰذا اس قول کی اہمیت ویسے ہی کم ہو جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ علامہ آمدیؒ نے اس مسئلے میں ایک ہی رائے کا بالجزم اظہار کیا ہے اور مندوب والی رائے بیان نہیں کی ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے جبلی افعال کو مندوب کہنے والے علماء کا موقف اس اعتبار سے بھی کمزور ہے کہ یہ صحابہؓ کے عمل کے خلاف ہے' جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ نے واضح کیا ہے۔اس کے بعد امام صاحبؒ لکھتے ہیں:

أن المتابعة أن يفعل مثل ما فعل على الوجه الذى فعل' فإذا فعل فعلا على وجه العبادة شرع لنا أن نفعله على وجه العبادة' و إذا قصد تخصيص مكان أو زمان بالعبادة خصصناه بذلک' كما كان يقصد أن يطوف حول الكعبة' وأن يستلم الحجر الأسود' و أن يصلى خلف المقام' وكان يتحرى الصلاة عند أسطوانة مسجد المدينة' وقصد الصعود على الصفا والمروة والدعاء والذكر هناک' و كذلک عرفة و المزدلفة و غيرها. وما فعله بحكم الاتفاق و لم يقصده مثل أن ينزل بمكان و يصلى فيه لكونه نزله لا قصدا لتخصيصه بالصلاة و النزول فيه فإذا قصدنا تخصيص ذلک المكان بالصلاة أو النزول لم نكن متبعين بل هذا من البدع التى كان ينهى عنها عمر بن الخطاب كما ثبت بالاسناد الصحيح من حديث شعبة عن سليمان التميمى عن المعرور بن سويد قال: كان عمر بن الخطاب فى سفر فصلى الغداة' ثم أتى على مكان فجعل الناس يأتونه و يقولون: صلى فيه النبى ﷺ' فقال عمر: إنما هلک أهل الكتاب أنهم اتبعوا أنبيائهم فاتخذوها كنائس و بيعا' فمن عرضت له الصلاة فليصل' و إلا فليمض(۱۰۹)

''رسول اللہ ﷺ کی متابعت کا مفہوم یہ ہے کہ وہی کام کیا جائے جو کہ آپؐ نے کیا ہے اور اسی طور پر کیا جائے جیسا کہ آپ نے اس کو کیا ہے (یعنی اگر اللہ کے رسول ﷺ نے اس کو عبادت کے طور پر

کیا ہے تو اس کو بطور عبادت کیا جائے اور اگر آپ نے اسے اتفاقاً یا عادتاً کیا ہے تو ہم بھی اسے ایک اتفاق یا عادت کے طور پر کریں)۔ پس جب آپ ﷺ نے ایک کام عبادت کے طور پر کیا ہے تو ہمارے لیے بھی مشروع یہ ہے کہ ہم اسے بطور عبادت ہی کریں۔ اور اگر آپؐ نے کسی عبادت والے کام کو کسی جگہ یا وقت کے ساتھ مخصوص کیا ہے تو ہم بھی اس عبادت والے کام کی اس جگہ یا وقت کے ساتھ تخصیص کریں' جیسا کہ آپ ﷺ کوشش کرتے تھے کہ بیت اللہ کے گرد طواف کریں' حجر اسود کا استلام کریں' مقام ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھیں' اور مسجد نبوی کے ستون کے پاس نماز پڑھیں۔ اور آپؐ نے صفا اور مروہ پر چڑھنے اور ان پر دعا اور ذکر واذکار کا کام قصداً کیا ہے۔ اسی طرح کا معاملہ عرفات اور مزدلفہ کے قیام کا بھی ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے جو کام اتفاقاً کیا ہے اور آپؐ نے اس کام کے کرنے میں عبادت کا قصد نہیں کیا' مثلاً آپ نے کسی خاص جگہ اتفاقاً نماز پڑھی یا قیام کیا تو ہم اس جگہ نماز پڑھنے یا قیام کرنے میں اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع نہیں کریں گے اور ایسے کاموں میں آپ کی اتباع ایسی بدعت ہے جس سے حضرت عمر h منع کرتے تھے' جیسا کہ صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت شعبہ بن سلیمان التمیمیؒ حضرت معرور بن سویدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ سفر میں صبح کی نماز پڑھائی' پھر آپ ایک ایسے مقام پر آئے جہاں لوگوں کا ہجوم تھا اور لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہاں نماز پڑھی ہے (یعنی ہم بھی آپ ﷺ کی اتباع میں اس جگہ نماز پڑھیں) تو حضرت عمرؓ نے کہا: تم سے پہلی قومیں اس لیے ہلاک ہوگئیں کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی اتباع میں ان کی جگہوں کو اپنی عبادت گاہیں بنا لیا۔ پس جس کے لیے نماز کا وقت ہو جائے تو وہ نماز پڑھ لے اور اگر نماز کا وقت نہیں ہے تو (بجائے انتظار کرنے کے) آگے چلا جائے''۔

امام ابنِ تیمیہؒ نے متابعت کی تعریف واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر ایک کام کو اللہ کے رسول ﷺ نے اتفاقاً کیا ہے' مثلاً آپؐ نے گدھے پر سواری اتفاقاً کی ہے' اب اس کو عبادت یا ثواب کا کام سمجھ کر کرنا بدعت ہے' کیونکہ آپؐ نے جب اس فعل کو کیا تھا تو ثواب سمجھ کر نہیں کیا تھا۔ اس لیے جس کام کو آپؐ نے ثواب سمجھ کر نہیں کیا اس کو ثواب سمجھ کر کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک کام آپؐ کے نزدیک عبادت نہیں ہے اور ہم اس کو عبادت بنا لیں۔ اور یہی دین میں اضافہ اور بدعت ہے جس سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ اس مسئلے میں کسی صاحب عقل کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ آپ کا نماز میں بچے کو اٹھانا یا گدھے پر سوار ہونا بطور عبادت (یعنی اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے) نہیں تھا بلکہ اتفاقاً تھا۔ علامہ آمدیؒ نے ''الاحکام'' میں لکھا ہے کہ اتباع کی تعریف بالاتفاق یہ ہے کہ کسی کام کو اسی طور پر کیا جائے جس طرح آپ نے کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اگر کوئی کام اتفاقاً کیا ہے تو اس کو اتفاق سمجھ کر کیا جائے' جیسا کہ گدھے کی سواری' اور اگر آپ نے کسی کام کو جبلی تقاضوں کے تحت کیا ہو تو اس کو آپ کا جبلی فعل سمجھ کر اس کی پیروی کی جائے نہ کہ دین سمجھ کر' جیسا کہ کدو کھانا۔ اور اگر آپ ﷺ نے کسی فعل کو تقرب الی اللہ کی نیت

اور ارادے سے کیا ہے تو اس فعل میں آپ کی اتباع اسی نیت و ارادے سے کی جائے اور اس فعل کو دین سمجھا جائے' اس پر ثواب کی امید رکھی جائے وغیرہ۔ صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ نے نماز پڑھائی اس حال میں کہ آپؐ نے اپنے گریبان کے بٹن کھولے ہوئے تھے۔ اب اگر کوئی شخص نماز میں یہ حالت عبادت یا ثواب سمجھ کر اختیار کرتا ہے تو یہ بدعتی ہے' کیونکہ آپؐ نے اس فعل کو اتفاقاً کیا اور عبادت سمجھ کر نہ کیا تھا۔ اس شخص نے نماز کی سنن میں ایک ایسے فعل کا اضافہ سنت سمجھ کر کر دیا ہے جو درحقیقت نماز کی سنت نہیں ہے۔ اس فعل کے اتفاقی ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر نماز میں گریبان کھلا رکھنا عبادت یا باعث ثواب ہوتا تو صحابہؓ بھی اس فعل میں آپؐ کی متابعت کرتے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے جبلی یا اتفاقی امور کے سنت نہ ہونے کی دلیل حضرت عبداللہ بن عباس i کی درج ذیل روایت بھی ہے۔ حضرت ابوطفیلؒ نے ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے کہا:

يَزْعُمُ قَوْمُكَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ طَافَ عَلٰى بَعِيْرٍ بِالْبَيْتِ وَاَنَّهُ سُنَّةٌ' قَالَ: صَدَقُوْا وَكَذَبُوْا' قُلْتُ مَا صَدَقُوْا وَمَا كَذَبُوْا؟ قَالَ: صَدَقُوْا طَافَ عَلٰى بَعِيْرٍ وَلَيْسَ بِسُنَّةٍ' اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ لَا يَصْرِفُ النَّاسُ عَنْهُ وَلَا يَدْفَعُ فَطَافَ عَلَى الْبَعِيْرِ حَتّٰى يَسْمَعُوْا كَلَامَهُ وَلَا تَنَالُهُ اَيْدِيْهِمْ(۱۱۰)

''آپ کی قوم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اونٹ پر بیٹھ کر بیت اللہ کا طواف کیا اور یہ سنت ہے! تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا کہ ایک بات میں وہ سچے ہیں اور ایک میں جھوٹے ہیں۔ میں نے کہا: ان کی کون سی بات سچی ہے اور ان کی کس بات میں جھوٹ ہے؟ تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ نے اونٹ پر بیت اللہ کا طواف کیا (یعنی یہ بات درست ہے) اور یہ سنت نہیں ہے (یعنی اس فعل کو سنت کہنا جھوٹ ہے)۔ (اصل معاملہ یہ ہے کہ) اللہ کے رسول ﷺ سے لوگ ہٹتے نہیں تھے (یعنی آپؐ پر ہجوم کر لیتے تھے) پس آپ ﷺ نے اونٹ پر طواف کیا تاکہ لوگ آپؐ کی بات اچھی طرح سن سکیں اور ان کے ہاتھ آپ تک نہ پہنچ سکیں (اور آپؐ کو تکلیف نہ ہو)''۔

یہ روایت صحیح مسلم میں بھی موجود ہے لیکن اس میں بیت اللہ کے طواف کی بجائے صفا اور مروہ کے طواف کا ذکر ہے۔ سنن ابی داؤد' مسند احمد اور بعض دوسری کتب احادیث میں بھی یہ روایت موجود ہے لیکن وہاں بھی صفا و مروہ کے درمیان سعی کا ذکر ہے۔ بعض دوسری صحیح روایات سے بھی صرف یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے بیت اللہ کا طواف بھی اونٹ پر بیٹھ کر کیا تھا(۱۱۱)۔ علامہ البانیؒ نے ان دونوں روایات کو حسن کہا ہے جبکہ ابن دقیق العیدؒ نے بیت اللہ کے اونٹ پر بیٹھ کر طواف کرنے والی روایت کو 'ثابت' کہا ہے(۱۱۲)۔ ابن العربی نے بھی اس روایت کو صحیح کہا ہے(۱۱۳)۔

اہم نکتہ: یہ واضح رہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے وہ جبلی افعال جن کو آپؐ نے اُمت کے لیے تشریع کے طور پر جاری کیا ہے، وہ مستحبات میں شمار ہوں گے اور ان کا کرنا باعث اجر وثواب اور درجات کی بلندی کا سبب ہوگا، جیسا کہ آپ ﷺ نے 'بِسْمِ اللّٰهِ' پڑھ کر اور دائیں ہاتھ سے کھانے کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح آپؐ نے رات کو سونے کی دعا پڑھ کر اور دائیں کروٹ پر سونے کی تلقین کی ہے، وغیر ذلك۔ جبلی افعال میں آپؐ کا حکم نہ بھی ہو، جیسا کہ مذکورہ بالا مثالوں میں ہے، لیکن اگر احادیث میں کوئی ایسا قرینہ بھی موجود ہو جو اس بات پر دلالت کر رہا ہو کہ آپؐ نے یہ کام بطور تشریع کے کیا ہے تو پھر بھی آپؐ کا ایسا جبلی فعل امت کے حق میں مشروع اور مستحب ہوگا۔ کیا کسی جبلی فعل پر آپؐ کی مواظبت اور دوام اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ فعل بھی امت کے حق میں مستحب کا درجہ رکھتا ہے؟ اس مسئلے میں علماء کا اختلاف ہے جس کو تفصیل کے ساتھ امام زرکشیؒ نے 'البحر المحیط' میں بیان کیا ہے، طوالت کے خوف سے ہم اس بحث کو یہاں بیان نہیں کر رہے ہیں۔

(۲) عادی اُمور

عادی اُمور سے مراد وہ امور ہیں جو معاشرے کے عرف، رواج وغیرہ کی وجہ سے سرانجام دیے جائیں، مثلاً جسم ڈھانپنا انسان کے لیے ایک جبلی امر ہے۔ اب ایک خاص علاقے میں جسم ڈھانپنے کے لیے تہبند استعمال ہوتا ہے تو اپنے علاقے کے رسم ورواج کا لحاظ رکھتے ہوئے تہبند پہننا امورِ عادیہ میں شمار ہوگا۔ اسی طرح کھانا کھانا جبلی اُمور میں سے ہے۔ اب ایک علاقے میں چاول کھانے کا رواج زیادہ ہے تو کھانے میں چاول ہی کھانا امور عادیہ میں سے ہوگا۔ آپ ﷺ کا تہبند باندھنا اور عمامہ باندھنا اُمورِ عادیہ میں سے ہے۔ عادت اصول فقہ کی ایک اصطلاح ہے جو کہ عرف کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ علامہ احمد العدویؒ لکھتے ہیں:

> **محض الفعل لا يدل على أن الفعل قربة، بل يدل على أنه ليس بمحرم فقط، وأما كونه قربة على الخصوص فذلك شيء آخر، فإن الصحابة رضوان الله عليهم و هم أعلم الناس بالدين و أحرص الناس على اتباع الرسول في كل ما يقرب إلى الله تعالى كانوا يشاهدون من النبيﷺ أفعالا، ولما لم يظهر لهم فيها قصد القربة لم يتخذوها دينا يتعبدون به ويدعون الناس إليه ولذلك أمثلة كثيرة**(۱۱)
>
> ''محض رسول اللہ ﷺ کا کسی کام کو کرنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ آپؐ نے وہ کام اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کے لیے کیا ہے، بلکہ اس سے صرف یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ کام کرنا حرام نہیں ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ آپؐ نے وہ کام اللہ کے قرب کے حصول کے لیے کیا یہ ایک دوسری چیز ہے۔ صحابہ کرامؓ جو دین کو سب سے زیادہ جاننے والے اور لوگوں میں اللہ کے رسول ﷺ کی ایسے افعال میں اتباع میں سب سے زیادہ حریص تھے جو اللہ کے قریب کرتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ کے افعال کا مشاہدہ کرتے تھے، اس لیے جب انہیں آپ ﷺ کے کسی فعل میں یہ نظر آتا تھا کہ آپؐ نے

وہ فعل اللہ کے قرب کے حصول کے لیے نہیں کیا تو وہ اس فعل کو دین نہیں بناتے تھے اور نہ ہی لوگوں کو اس کی ترغیب وتشویق دلاتے تھے اور آپؐ کے ایسے افعال کی مثالیں بہت زیادہ ہیں (یعنی جن کو صحابہؓ نے نہ دین بنایا ہے اور نہ ہی ان کی اتباع کی دعوت دی ہے)''۔

رسول اللہ ﷺ کے عادی اُمور ہمارے لیے تشریع ہیں یا نہیں ہیں' اس کی وضاحت میں درج ذیل روایت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس i سے مروی ہے:

اُتِیَ النَّبِیُّ ﷺ بِضَبٍّ مَشْوِیٍّ فَأَهْوٰی اِلَیْهِ لِیَأْکُلَ' فَقِیْلَ لَهٗ اِنَّهٗ ضَبٌّ' فَأَمْسَکَ یَدَهٗ' فَقَالَ خَالِدٌ: أَحَرَامٌ هُوَ؟ قَالَ: ((لَا وَلٰـکِنَّهٗ لَا یَکُوْنُ بِأَرْضِ قَوْمِیْ فَأَجِدُنِیْ أَعَافُهٗ)) فَأَکَلَ خَالِدٌ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَنْظُرُ(۱۱۵)

''اللہ کے رسول ﷺ کے پاس ایک بھنی ہوئی گوہ لائی گئی۔ آپؐ اس کو کھانے کے لیے جھکے تو آپؐ سے کہا گیا کہ یہ گوہ ہے۔ پس آپؐ نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے سوال کیا کہ کیا یہ حرام ہے؟ تو آپؐ نے جواب دیا: ''نہیں' لیکن چونکہ یہ جانور میری قوم کی سرزمین (یعنی مکہ) میں نہیں پایا جاتا اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا''۔ پس حضرت خالدؓ نے اس کو کھایا اور رسول اللہ ﷺ ان کو دیکھ رہے تھے''۔

اللہ کے رسول ﷺ نے گوہ کو اس لیے نہیں کھایا کہ آپؐ کے علاقے میں یہ نہیں کھائی جاتی تھی' یعنی آپؐ نے عادتاً گوہ کے کھانے کو ترک کیا ہے نہ کہ شرعاً۔ اب اگر کسی شخص کو گوہ کا گوشت پیش کیا جائے اور وہ عادتاً گوہ کا گوشت نہ کھائے یعنی اس کے علاقے میں گوہ نہیں کھائی جاتی لہٰذا وہ بھی گوہ نہیں کھاتا تو یہ صحیح عمل ہے اور آپؐ کی متابعت واتباع شمار ہوگا' لیکن اگر کوئی یہ عمل ایسی سنت سمجھ کر کرے کہ جس میں ثواب کا بھی یقین رکھا جائے تو اس صورت میں گوہ کا گوشت نہ کھانا بدعت ہوگا۔ اس طرح کا معاملہ ان چیزوں کا بھی ہے جن کو آپؐ طبعاً ناپسند کرتے تھے۔ مثلاً آپ ﷺ کو لہسن اور پیاز کھانا طبعاً ناپسند تھا۔ فتح خیبر کے موقع پر صحابہؓ کو بہت بھوک لگی تھی تو انہوں نے مال غنیمت میں حاصل ہونے والے یہودیوں کے کھیتوں سے کثرت سے لہسن کھایا۔ جب صحابہؓ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے آئے تو آپؐ نے ان کے مونہوں سے لہسن کی بو محسوس کی تو آپؐ نے فرمایا:

((مَنْ اَکَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ الْخَبِیْثَةِ شَیْئًا فَلَا یَقْرَبَنَّا فِی الْمَسْجِدِ)) فَقَالَ النَّاسُ: حُرِّمَتْ' حُرِّمَتْ فَبَلَغَ ذَاکَ النَّبِیَّ ﷺ فَقَالَ: ((أَیُّهَا النَّاسُ اِنَّهٗ لَیْسَ بِیْ تَحْرِیْمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لِیْ وَلٰـکِنَّهَا شَجَرَةٌ اَکْرَهُ رِیْحَهَا))(۱۱۶)

''جس نے بھی اس خبیث درخت میں سے کھایا ہو وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے''۔ اس پر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ لہسن حرام کر دیا گیا ہے' لہسن حرام کر دیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کو جب اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: ''اے لوگو! میرے پاس یہ اختیار نہیں ہے کہ جس کو اللہ نے میرے

لیے حلال قرار دیا ہو اُس کو حرام ٹھہراؤں۔ یہ تو ایک درخت ہے جس کی بو مجھے بڑی ناپسند ہے''۔

اللہ کے رسول ﷺ طبعاً لہسن اور پیاز وغیرہ کو ناپسند کرتے تھے لیکن یہ شرعاً حرام نہیں ہیں۔ صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ کو اگر ایسا کھانا ہدیہ کیا جاتا جس میں لہسن ہوتا تو آپؐ اس کو نہ کھاتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ نے ایسا ہی کھانا حضرت ابوایوب انصاری h کی طرف بھجوا دیا تو انہوں نے یہ کہہ کر اس کھانے کو نہ کھایا کہ جو اللہ کے رسول ﷺ کو ناپسند ہے وہ مجھے بھی ناپسند ہے۔ صحیح روایات کے مطابق جمہور صحابہؓ پیاز اور لہسن استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اللہ کے رسول ﷺ سے محبت اور تعلق کے اظہار کے لیے لہسن اور پیاز کھانا بند کر دے تو یہ ایک جائز امر ہے اور آپ سے محبت کا اظہار ہے اور اِن شاء اللہ باعث اجر و ثواب ہے' لیکن اگر کوئی پیاز اور لہسن کو نہ کھانے کو سنت شرعیہ یا باعث ثواب امر سمجھے تو یہ بدعت ہے' کیونکہ آپ ﷺ نے پیاز کا شرعی حکم خود ہی واضح کر دیا ہے کہ یہ حلال ہے۔ یہ واضح رہے کہ مسجد میں پیاز یا لہسن کھا کر آنا آپ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی ہونے کی وجہ سے خلافِ سنت امر ہے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ کو کدو بہت پسند تھے اور آپؐ سالن میں سے کدو تلاش کر کر کے کھاتے تھے۔ اسی وجہ سے حضرت انس h بھی سالن میں سے کدو تلاش کر کے کھاتے تھے۔ کدو کی طرف آپ ﷺ کی رغبت ایک طبعی امر تھا نہ کہ اللہ کا حکم' اسی لیے یہ کہنا ناممکن ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کدو اس لیے کھائے تاکہ اللہ کا قرب حاصل کر سکیں یا آپؐ نے کدو بطور عبادت کے کھائے ہیں' یعنی ان کے کھانے کو باعث ثواب سمجھا ہے۔ جب اللہ کے رسول ﷺ نے کدو کو بطور عبادت یا ثواب کی نیت سے نہیں کھایا تو ایک اُمتی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کدو اس وجہ سے کھائے کہ اس کا کھانا ایسی سنت ہے جس پر وہ اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔ اسی طرح کا معاملہ ثرید اور دوسرے کھانوں کا بھی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا تہبند باندھنا' عمامہ باندھنا' موزے پہننا وغیرہ بھی عادی امور میں سے ہے' کیونکہ صحابہؓ عمامہ بھی باندھتے تھے اور صرف ٹوپی بھی پہنتے تھے' تہبند بھی باندھتے تھے اور شلوار بھی پہنتے تھے' موزے بھی پہنتے تھے اور بغیر موزوں کے بھی رہتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ حالت احرام میں انسان کون سا لباس پہن سکتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَلْبَسُوا الْقُمُصَ وَلَا الْعَمَائِمَ وَلَا السَّرَاوِيْلَاتِ وَلَا الْبَرَانِسَ وَلَا الْخِفَافَ))(۱۱۷)

''قمیصیں' عمامے' شلواریں' لمبی ٹوپیاں اور موزے (حالت احرام میں) نہ پہنو۔''

اللہ کے رسول ﷺ نے حالت احرام میں صحابہ j کو ٹوپی اور شلوار پہننے سے منع کیا ہے تو معلوم ہوا کہ صحابہؓ کی ایک جماعت ابتداءً ٹوپی اور شلوار بھی پہنتی تھی' اسی لیے تو آپ ﷺ نے منع کیا تھا۔ صحیح احادیث سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ بغیر ٹوپی اور عمامے کے بھی نماز پڑھ لیتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت محمد بن المنکدرؒ فرماتے ہیں:

رَاَیْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰہِ ﷺ یُصَلِّیْ فِیْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ وَقَالَ : رَاَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یُصَلِّیْ فِیْ ثَوْبٍ(۱۱۸)

''میں نے حضرت جابر بن عبداللہ h کو ایک کپڑے میں نماز پڑھتے دیکھا تو انہوں نے کہا: میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو ایک کپڑے میں نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''

بس اللہ کے رسول ﷺ نے اتنی ہدایت جاری فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص ایک کپڑے میں نماز پڑھنا چاہے تو کپڑے کو اپنے بدن پر اس طرح لپیٹ لے کہ ستر کے علاوہ اس کے کندھے بھی چھپ جائیں۔ حضرت ابو ہریرہ h فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لاَ یُصَلِّیْ اَحَدُکُمْ فِی الثَّوْبِ الْوَاحِدِ لَیْسَ عَلٰی عَاتِقَیْهِ شَیْءٌ)) (۱۱۹)

''تم میں کوئی شخص ایک کپڑے میں نماز اس طرح نہ پڑھے کہ اس کے دونوں کندھوں پر کچھ نہ ہو۔''

ایک اور روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ عموماً بغیر ٹوپی اور عمامے کے نماز پڑھتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ h فرماتے ہیں:

قَامَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَسَاَلَهٗ عَنِ الصَّلَاةِ فِی الثَّوْبِ الْوَاحِدِ فَقَالَ: ((اَوَ کُلُّکُمْ یَجِدُ ثَوْبَیْنِ؟)) ثُمَّ سَاَلَ رَجُلٌ عُمَرَ فَقَالَ: اِذَا وَسَّعَ اللّٰهُ فَاَوْسِعُوْا' جَمَعَ رَجُلٌ عَلَیْهِ ثِیَابَهٗ صَلّٰی رَجُلٌ فِیْ اِزَارٍ وَ رِدَاءٍ فِیْ اِزَارٍ وَقَمِیْصٍ فِیْ اِزَارٍ وَقَبَاءٍ فِیْ سَرَاوِیْلَ وَ رِدَاءٍ فِیْ سَرَاوِیْلَ وَقَمِیْصٍ فِیْ سَرَاوِیْلَ وَقَبَاءٍ فِیْ تُبَّانٍ وَقَبَاءٍ فِیْ تُبَّانٍ وَقَمِیْصٍ' قَالَ وَاَحْسِبُهٗ قَالَ فِیْ تُبَّانٍ وَرِدَاءٍ(۱۲۰)

''ایک آدمی اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے بارے میں سوال کیا (کہ کیا یہ جائز ہے؟) تو آپؐ نے فرمایا: ''کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے ہیں؟'' (یعنی تم خواہ مخواہ سوال تو نہیں کر رہے ہو؟ حالانکہ کئی صحابہؓ کے پاس ستر ڈھانپنے کے لیے بھی ایک سے زائد کپڑا موجود نہیں ہے)۔ اسی طرح حضرت عمر h سے جب کسی نے یہی سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا: اللہ نے تم کو وسعت دی ہے تو اس وسعت کو اختیار کرو (یعنی ایک کپڑے میں نماز پڑھنا تو جائز ہے لیکن جب تمہارے پاس ایک سے زائد کپڑے موجود ہیں تو ان کو پہنو)۔ ایک آدمی کو اپنے بدن کو کپڑوں سے ڈھانپنا چاہیے۔ ایک آدمی کو چاہیے کہ وہ ایک تہبند اور چادر میں یا ایک تہبند اور قمیص میں یا ایک تہبند اور چوغے میں یا شلوار اور چادر میں یا شلوار اور قمیص میں یا شلوار اور چوغے میں یا لنگوٹ اور چوغے میں یا لنگوٹ اور قمیص میں نماز پڑھے۔ حضرت ابو ہریرہ h کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ بھی کہا کہ وہ لنگوٹ اور چادر میں نماز پڑھے''۔

اس روایت میں حضرت عمر h نے وسعت کے زمانے میں مسلمانوں کی نماز کا لباس تفصیل سے بیان کیا

ہے کہ جس میں دُور دُور تک کسی ٹوپی یا عمامے کا تذکرہ نہیں ہے۔اسی طرح اگر عمامہ ہی کو سنت کہا جائے تو تہبند پہننا بھی اسی درجے کی سنت ہونی چاہیے کیونکہ آپ نے عمامے کے ساتھ تہبند بھی باندھا ہے۔جبکہ حضرت عمر h تہبند کے علاوہ شلوار اور لنگوٹ میں بھی نماز پڑھنے کا حکم دے رہے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تہبند باندھنا یا شلوار پہننا صحابہؓ کے نزدیک ایک ہی حکم رکھتا تھا☆۔پس ثابت ہوا کہ آپ ﷺ نے عمامہ اور تہبند اللہ کا قرب حاصل کرنے یا عبادت کے لیے نہیں باندھا بلکہ آپ نے اپنے معاشرے کے مروج لباس کا لحاظ رکھتے ہوئے عمامہ اور تہبند باندھا ہے۔ایک صاحب نے جب ' **اللجنة الدائمة السعودية**' سے عمامے کے بارے میں سوال کیا تو **اللجنة الدائمة** کے شیوخ 'شیخ بکر ابوزید' شیخ عبدالعزیز آل الشیخ' شیخ صالح الفوزان' شیخ عبداللہ بن غدیان اور شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن بازؒ نے درج ذیل فتویٰ دیا۔ہم یہاں سوال اور جواب دونوں کو نقل کر رہے ہیں:

س: **أعفيتُ لحيتي وقصرتُ ثوبي ولبستُ العمامة بفضل اللّٰه' اتباعا واقتداء' ولكن الغريب في الأمر: ان الكثير و الكثير من الناس انكر على ذلك' واستهزؤوا بي لتركي الغترة و الشماغ و العقال' و ينظرون الى بسخرية و استنكار' وكاني أفعل شيئا منكرا أو غريبا. فهل الرسول ﷺ لبس العمامة' وهل هي سنة مؤكدة' هل هذه العمامة لا تصلح لهذا الزمان الذي نحن فيه؟ وما هي صفات رسول اللّٰه ﷺ في لبس العمامة؟ وهل كانت لها ألوان كالأبيض والأسود؟ وهل اؤثم على لبسها؟ وهل على إثم إن أنا حثيت من حولي على لبسها؟ أفيدوني أفادكم اللّٰه و جزاكم اللّٰه خيرا كثيرا.**

''سوال: میں نے اللہ کے نبی ﷺ کی اتباع اور اقتداء میں اپنی داڑھی بڑھالی ہے اور اپنے کپڑوں کو ٹخنوں سے اوپر کرلیا ہے اور اللہ کے فضل سے عمامہ بھی باندھ لیا ہے' لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اکثر لوگوں نے میرا اس بات پر مذاق اڑایا ہے اور اس کو ناپسند کیا ہے کہ میں نے سعودی رومال اور عقال پہننا چھوڑ دیا ہے' لوگ میری طرف مذاق اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے اس طرح دیکھتے ہیں گویا میں نے کوئی ناپسندیدہ اور عجیب کام کیا ہو۔کیا اللہ کے رسول ﷺ نے عمامہ باندھا ہے؟ کیا عمامہ باندھنا سنت مؤکدہ ہے؟ کیا اس زمانے میں جس میں ہم رہ رہے ہیں' عمامہ باندھنا ایک درست کام ہے؟ کیا اللہ کے رسول ﷺ کے عمامے کا رنگ کالا اور سفید تھا؟ کیا عمامہ باندھنے سے میں گناہگار ہوں گا؟ کیا اگر میں کسی کو عمامہ باندھنے کی ترغیب دوں تو یہ گناہ ہے؟ مجھے شرعی حکم بتا کر فائدہ پہنچائیں' اللہ بھی آپ کو فائدہ دے گا۔اللہ آپ کو جزائے خیر دے''۔

ج: **الحمد للّٰه الذي هداك و وفقك لاتباع السنة' وما ذكرتَه من إعفاء اللحية فهو**

☆ ایک مستقل مضمون میں ان شاء اللہ عمامے اور تہبند وغیرہ کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ j کا طرزِ عمل واضح کیا جائے گا۔

واجب؛ لأنه من سنن الأنبياء، و من خصال الفطرة، وقد نهى النبیﷺ عن حلق اللحية وقصها: لما فيه من التشبه بالكفار، وأما تقصير الثوب فالواجب تقصيره إلى الكعبين، وما نزل عن الكعبين فهوإسبال محرم وكبيرة من كبائر الذنوب، وأما لبس العمامة فهو من المباحات وليس بسنة كما توهمتَ، والأولى أن تبقى على ما يلبسه أهل بلدک على رؤوسهم من الغترة والشماغ ونحوه. وأما استهزاء الناس بل بسبب تمسک بالدين وحرصک على اتباع السنة فلا تلتفت إليه، ولا يهمک، وفقنا اللّٰه وإياک للفقه فی الدين والعمل بسنة سيد المرسلين. وباللّٰه التوفيق، وصلى اللّٰه على نبينا محمد و آله وصحبه و سلم[۱۲۱]

''جواب: تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے آپ کو ہدایت دی اور آپ میں اتباع سنت کا جذبہ پیدا کیا۔ جہاں تک داڑھی کو چھوڑنے کا ذکر ہے تو یہ فرض ہے اور انبیاء کی سنت ہے اور خصالِ فطرت میں سے ایک خصلت ہے۔ اللہ کے نبیﷺ نے داڑھی کو مونڈنے اور کتروانے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس میں کفار سے مشابہت ہے۔ جہاں تک کپڑوں کو اوپر کرنے کا معاملہ ہے تو ٹخنوں سے اوپر کپڑے کرنا واجب ہے، جو کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہوگا تو وہ اسبالِ ازار ہے اور یہ حرام اور کبیرہ گناہوں میں سے ایک گناہ ہے۔ جہاں تک عمامہ باندھنے کا تعلق ہے تو یہ مباحات میں سے ایک مباح ہے اور یہ سنت نہیں ہے جیسا کہ آپ کا وہم ہے۔ اور بہتر یہی ہے آپ اپنے علاقے کے لوگوں کا لباس پہنیں جیسا کہ وہ اپنے سروں پر رومال اور عقال لیتے ہیں۔ آپ کے دین کے ساتھ تمسک اور اتباع سنت پر حرص کی وجہ سے لوگ آپ کا جو مذاق اڑاتے ہیں تو اس کی پرواہ نہ کریں اور نہ ہی اس پر پریشان ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو دین کی سمجھ عطا کرے اور اللہ کے رسولﷺ کی سنت پر عمل کی توفیق دے۔ عمل کی توفیق اللہ ہی کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے نبیﷺ اور ان کی آل اور ان کے صحابہؓ پر رحم فرمائے''۔

عمامے سے متعلق ایک اور سوال کے جواب میں **اللجنة الدائمة** نے یہ جواب دیا:

ج: لبس العمامة من العادات وليس من العبادات، و إنما لبسها النبیﷺ لأنها كانت من لباس قومه، ولم يصح فی فضل العمائم شیء، غير أن النبی لبسها، فالمشروع للانسان أن يلبس ما تيسر له من لباس أهل بلده ما لم يكن محرما. وباللّٰه التوفيق و صلى اللّٰه على نبينا محمد وآله و صحبه وسلم[۱۲۲]

''جواب: عمامہ پہننا اللہ کے رسولﷺ کی عادات میں سے ہے اور یہ عبادت کا کام نہیں ہے۔ اللہ کے نبیﷺ نے عمامہ اس لیے باندھا ہے کہ یہ آپ کی قوم کا لباس تھا، عمامے کی فضیلت میں کوئی ایک بھی روایت صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، ہاں اللہ کے نبیﷺ کا عمامہ پہننا ثابت ہے۔ انسان کے لیے شرعی حکم یہ ہے کہ اس کے علاقے والوں کا جو لباس ہے وہ اس کو پہنے بشرطیکہ وہ حرام نہ ہو''۔

عمامے کی فضیلت میں بعض ضعیف اور موضوع روایات بھی پھیلا دی گئی ہیں' کسی مناسب وقت میں ہم ان تمام روایات کی استنادی حیثیت پر گفتگو کریں گے۔ یہ بات ثابت ہے کہ آپ ﷺ کے معاشرے میں کفار ومشرکین بھی عمامہ پہنتے' تہبند باندھتے اور موزے وغیرہ پہنتے تھے۔ لہٰذا آپ ﷺ سے تعلق ومحبت کے اظہار کرنے کے لیے یہ سب کام کرنا جائز ہیں' لیکن ان کو ثواب یا عبادت کی نیت سے کرنا بدعت ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مسلمان معاشروں میں علماء و مذہبی طبقوں کے رواج وعرف کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلامی تحریکوں کے کارکنان کے لیے اپنے سر کو ڈھانپنا یا ٹوپی پہننا ایک مستحسن امر ہے۔

اسی طرح اگر کسی عادی امر کے بارے میں احادیث میں کوئی قرائن موجود ہوں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان امور عادیہ کو بطور تشریع جاری کیا ہے تو وہ عادی امور اُمت کے حق میں مشروع ہوں گے۔ بعض امور عادیہ کے بارے میں علماء میں اختلاف بھی ہوا ہے کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ کے عادی امور ہیں یا آپ نے انہیں بطور دین جاری کیا ہے' جیسا کہ مصر اور بعض دوسرے ممالک کے علماء نے داڑھی کو اُمورِ عادیہ میں شمار کیا ہے جبکہ سعودیہ اور برصغیر کے علماء کے نزدیک داڑھی کا حکم آپ ﷺ نے بطور تشریع جاری کیا ہے' اور یہی رائے صحیح ہے' کیونکہ اس رائے کے حق میں قرائن ودلائل بہت قوی ہیں۔

(۳) افعالِ خصوصی

اللہ کے رسول ﷺ کے وہ افعال جو کہ آپؐ کے ساتھ خاص ہیں وہ اُمت کے لیے سنت نہیں ہیں' جیسا کہ آپ ﷺ کا چار سے زائد عورتوں سے شادی کرنا' صومِ وصال یعنی مغرب کے وقت بغیر افطار کیے مسلسل رات اور دن کا روزہ رکھنا اور عصر کے بعد نوافل پڑھنا وغیرہ۔ اصل قاعدہ یہی ہے کہ آپ ﷺ کے افعال اُمت کے لیے بھی تشریع ہیں' کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(الاحزاب:۲۱)

''البتہ تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ میں بہترین نمونہ ہے''۔

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے گا کہ فلاں فعل رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت ہے تو اسے اس کے لیے کوئی دلیل لانی پڑے گی۔ اگر کوئی دلیل مل جائے تو پھر آپ ﷺ کا وہ فعل اُمتِ مسلمہ کے لیے ایسی سنت کا درجہ نہیں رکھے گا جس کی اتباع مشروع ہو۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر i روایت کرتے ہیں:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْوِصَالِ' قَالُوْا: اِنَّكَ تُوَاصِلُ' قَالَ: ((اِنِّيْ لَسْتُ مِثْلَكُمْ اِنِّيْ اُطْعَمُ وَاُسْقٰى))(۱۲۳)

''اللہ کے رسول ﷺ نے (ایک دن صحابہؓ کو) صومِ وصال سے منع کیا تو صحابہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ بھی تو وصال کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ مجھے اپنے رب کی طرف سے کھلایا اور پلایا جاتا ہے''۔

اس حدیث میں یہ دلیل موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ہر فعل ہمارے لیے سنت نہیں ہے۔ جب صحابہؓ نے آپؐ کے فعل کو اپنے عمل کی دلیل بنایا تو آپؐ نے اپنے اور اُمتیوں کے فرق کو واضح کرتے ہوئے اپنے فعل کو اُمت کے حق میں مشروع قرار نہ دیا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے کسی فعل کے بارے میں اسی نص میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہوتا جو اس کی خصوصیت پر دلالت کر رہا ہو، حالانکہ وہ فعل آپؐ کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔

حضرت عائشہ k کا فرمان ہے:

مَا تَرَکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ السَّجْدَتَیْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ عِنْدِیْ قَطُّ(۱۲۴)

''اللہ کے رسول ﷺ نے میرے پاس عصر کے بعد کی دو رکعتیں کبھی بھی ترک نہ کیں''۔

اسی حدیث کی بنا پر بعض صحابہ کرام j عصر کے بعد نفل نماز پڑھ لیتے تھے۔ جیسا کہ عبدالعزیز بن رفیعؒ فرماتے ہیں:

رَأَیْتُ عَبْدَ اللّٰہِ بْنَ الزُّبَیْرِ یُصَلِّیْ رَکْعَتَیْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ وَیُخْبِرُ اَنَّ عَائِشَۃَ k حَدَّثَتْہُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَمْ یَدْخُلْ بَیْتَھَا اِلَّا صَلَّاھُمَا(۱۲۵)

''میں نے حضرت عبداللہ بن زبیر i کو دیکھا کہ وہ عصر کے بعد دو رکعتیں نماز پڑھ لیا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ حضرت عائشہؓ نے ان کو یہ خبر دی ہے کہ جب بھی اللہ کے رسول ﷺ (عصر کے بعد) حضرت عائشہؓ کے پاس داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے یہ دو رکعتیں ادا کیں''۔

لیکن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عمرؓ عصر کے بعد نفل نماز پڑھنے پر لوگوں کو مارا کرتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ صرف اللہ کے رسول ﷺ کا خاصہ تھا۔ حضرت کریبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ازہر j نے ان کو حضرت عائشہؓ کے پاس بھیجا اور یہ کہا کہ حضرت عائشہ k کو ہماری طرف سے سلام کہنا اور عصر کے بعد دو رکعتوں کے بارے میں پوچھنا اور یہ کہنا:

اِنَّا اُخْبِرْنَا عَنْکِ اَنَّکِ تُصَلِّیْنَھُمَا وَقَدْ بَلَغَنَا اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَھٰی عَنْھَا، وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَکُنْتُ اَضْرِبُ النَّاسَ مَعَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ عَنْھَا..... (۱۲۶)

''ہمیں یہ خبر دی گئی ہے کہ آپ بھی عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھتی ہیں اور ہمیں نبی کریم ﷺ سے یہ حدیث پہنچی ہے کہ آپ نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع کیا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا ہے: میں اور حضرت عمرؓ ایسے شخص کو مارا کرتے تھے (جو کہ عصر کے بعد نماز پڑھتا تھا).....''

اسی روایت میں آگے چل کر بیان ہوا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت کریبؒ کو حضرت اُمّ سلمہ k کے پاس بھیج دیا تو حضرت اُمّ سلمہؓ نے اس بات کی وضاحت کی کہ آپ ﷺ عصر کے بعد دو رکعتیں کیوں پڑھتے تھے۔ حضرت اُمّ سلمہ k فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس ایک دفعہ بنوعبدالقیس کے لوگ آئے جن کی وجہ سے آپ ظہر کے بعد کی دو رکعتیں نہ پڑھ سکے یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو گیا۔ عصر

کے بعد آپﷺ اندر تشریف لائے اور آپﷺ نے ظہر کی دو رکعتیں ادا کیں۔صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ چونکہ آپﷺ کا معمول تھا کہ جب ایک کام شروع کر لیتے تھے تو اس پر مداومت کرتے تھے' اسی لیے آپؐ نے عصر کے بعد مستقل طور پر دو رکعتیں پڑھنی شروع کر دیں۔عصر کے بعد آپﷺ کے نماز پڑھنے کی یہ وجہ بعض صحابہ i کو معلوم نہ ہو سکی' جس کی بنا پر وہ ایک ایسے عمل کو سنت سمجھ کر کرتے رہے جس سے آپؐ نے منع فرمایا تھا' جیسا کہ آپﷺ کا فرمان ہے:

((لَا صَلَاةَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتّٰى تَرْتَفِعَ الشَّمْسُ وَلَا صَلَاةَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتّٰى تَغِيْبَ الشَّمْسُ))(۱۲۷)

''فجر کی فرض نماز کے بعد سورج چڑھ آنے تک کوئی نماز نہیں ہے اور عصر کی فرض نماز کے بعد سورج غروب ہونے تک کوئی نماز نہیں ہے''۔

علامہ آمدیؒ اس اصول کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وأما ما سوی ذلک مما ثبت کونه من خواصه التی لا یشارکه فیها أحد فلا یدل ذلک علی التشریک بیننا و بینه إجماعا(۱۲۸)

''اس کے علاوہ آپﷺ کے وہ افعال جن کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ وہ صرف آپؐ کے لیے تھے اور اُمت میں سے کوئی بھی آپؐ کے ان افعال میں شریک نہیں ہے تو اس بات پر اجماع ہے کہ آپﷺ کے ایسے افعال کسی اُمتی کے حق میں مشروع نہیں ہیں''۔

(۴) فعلِ محض کا درجہ

اللہ کے رسولﷺ کے صرف عمل سے کسی فعل کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔امام ابن حزمؒ نے اپنی کتاب 'الاحکام فی أصول الأحکام' میں لکھا ہے کہ قرآن کی آیت ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ میں 'لَکُمْ' کے ساتھ خطاب ہے۔اگر یہاں 'لَکُمْ' کی بجائے 'عَلَیْکُمْ' ہوتا تو آپﷺ کے عمل سے کسی فعل کا وجوب ثابت ہو سکتا تھا۔لیکن یہ بات واضح رہے کہ کسی امر کے بیان یا اس کی تنفیذ میں آپﷺ کا فعل وجوب کا حامل ہو سکتا ہے۔جیسا کہ آپؐ نے حکم جاری فرمایا: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ))(۱۲۹) یعنی نماز پڑھو جیسا کہ مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔اور آپﷺ کا ارشاد ہے: ((خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ))(۱۳۰) یعنی مجھ سے حج کے طریقے سیکھ لو۔یہ اللہ کے رسولﷺ کا ایک امر ہے۔اب اس امر کی تنفیذ یا بیان کے لیے آپؐ نے جس طریقے سے نماز یا حج ادا کیا اس طریقے کے مطابق نماز یا حج ادا کرنا فرض ہے۔

لیکن اس میں بھی یہ بات واضح رہے کہ آپﷺ کے ایسے امور کا بیان جب آپؐ کے افعال کی صورت میں سامنے آتا ہے تو ان امور کے بیان میں وہ تمام افعال فرض یا سنت نہیں ہوتے بلکہ ان میں سے بعض اُمورِ عادت سے متعلق بھی ہوتے ہیں۔مثلاً صحیحین میں ہے:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ کَانَ یُصَلِّیْ وَھُوَ حَامِلٌ اُمَامَۃَ بِنْتَ زَیْنَبَ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ(۱۳۱)

''اللہ کے رسول ﷺ اپنی نواسی حضرت امامہ بنت زینب k کو اٹھا کر نماز پڑھتے تھے''۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے' حضرت ابوقتادہ انصاری h فرماتے ہیں:

رَأَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَؤُمُّ النَّاسَ وَاُمَامَۃُ بِنْتُ اَبِی الْعَاصِ وَھِیَ ابْنَۃُ زَیْنَبَ بِنْتِ النَّبِیِّ ﷺ عَلٰی عَاتِقِہٖ فَاِذَا رَکَعَ وَضَعَھَا وَاِذَا رَفَعَ مِنَ السُّجُوْدِ اَعَادَھَا(۱۳۲)

''میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو لوگوں کی امامت کرواتے دیکھا جبکہ آپؐ نے حضرت زینب بنت امامہ k کو اپنی گردن پر بٹھایا ہوا تھا۔ جب آپؐ رکوع کرتے تھے تو ان کو اتار کر رکھ دیتے تھے اور جب سجدے سے اٹھتے تھے تو ان کو دوبارہ اٹھا لیتے تھے''۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت امامہ بنت زینب k کو فرض نماز میں اپنی گردن پر بٹھا کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ اب جن صحابہؓ نے آپ ﷺ کو اس طرح نماز پڑھاتے دیکھا تو کیا ان کے لیے یہ واجب یا فرض ہو گیا کہ وہ اپنی نواسیوں کو اپنی گردنوں پر بٹھا کر نماز پڑھیں یا پڑھائیں؟ کوئی بھی صحابیؓ آپؐ کی اقتدا میں اپنی نواسی کو مسجد میں نہیں لایا تاکہ وہ بھی اسی طرح نماز پڑھے جیسے کہ اللہ کے رسول ﷺ نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس لیے اللہ کے رسول ﷺ کے حکم ((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) میں آپؐ کے کون سے افعال اس حکم کا بیان ہیں اور کون سے امور عادیہ میں سے ہیں' ان میں فرق کرنا پڑے گا۔ اور اس میں بعض اوقات فقہاء میں اختلاف بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً تمام فقہاء اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے نماز میں جلسۂ استراحت کیا' یعنی پہلی اور تیسری رکعت میں دو سجدوں کے بعد پہلے بیٹھے اور پھر قیام کیا۔ لیکن احناف کے نزدیک یہ آپ ﷺ کے عادی اُمور میں سے ہے' آپؐ نے نماز میں جلسۂ استراحت بڑھاپے کی وجہ سے کیا۔ آپ ﷺ کا یہ فعل ((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) کا بیان نہیں ہے' جبکہ جمہور علماء جلسۂ استراحت کو ((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) کا بیان مانتے ہیں۔ اسی طرح صحیح احادیث میں ہے کہ حج کے دوران عرفات سے منیٰ واپسی تک کا سفر آپ ﷺ نے اونٹ پر کیا' حتیٰ کہ آپؐ نے بیت اللہ کا طواف بھی اونٹ پر کیا' اور صفا و مروہ کی سعی بھی۔ تو کیا اونٹ پر بیٹھ کر بیت اللہ کا طواف کرنا یا صفا و مروہ کی سعی کرنا واجب یا فرض ہے؟ واجب یا فرض تو کجا' یہ سنت بھی نہیں ہے! حضرت ابوطفیلؒ نے حضرت عبداللہ بن عباس i سے کہا:

یَزْعُمُ قَوْمُکَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ طَافَ عَلٰی بَعِیْرٍ بِالْبَیْتِ وَاَنَّہٗ سُنَّۃٌ' قَالَ صَدَقُوْا وَکَذَبُوْا' قُلْتُ مَا صَدَقُوْا وَمَا کَذَبُوْا؟ قَالَ صَدَقُوْا طَافَ عَلٰی بَعِیْرٍ وَلَیْسَ بِسُنَّۃٍ' اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ کَانَ لَا یَصْرِفُ النَّاسُ عَنْہُ وَلَا یَدْفَعُ فَطَافَ عَلَی الْبَعِیْرِ حَتّٰی

يَسْمَعُوْا كَلَامَهُ وَلَا تَنَالُهُ اَيْدِيْهِمْ(۱۳۳)

''آپ کی قوم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اونٹ پر بیٹھ کر بیت اللہ کا طواف کیا اور یہ سنت ہے۔تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا کہ ایک بات میں وہ سچے ہیں اور ایک میں جھوٹے ہیں۔میں نے کہا: ان کی کون سی بات سچی ہے اور ان کی کس بات میں جھوٹ ہے؟ تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ نے اونٹ پر بیت اللہ کا طواف کیا (یہ بات درست ہے) اور یہ سنت نہیں ہے (یعنی اس فعل کو سنت کہنا جھوٹ ہے)۔(اصل معاملہ یہ ہے کہ) اللہ کے رسول ﷺ سے لوگ ہٹتے نہیں تھے (یعنی آپؐ پر ہجوم کر لیتے تھے) پس آپؐ نے اونٹ پر طواف کیا تا کہ لوگ آپ کی بات اچھی طرح سن سکیں اور ان کے ہاتھ آپؐ تک نہ پہنچ سکیں''۔

بعض اوقات صحابہ j میں بھی اس امر میں اختلاف ہو جاتا تھا کہ حج کے دوران آپؐ کا فلاں فعل ((خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ)) کا بیان یعنی وضاحت ہے یا امور عادیہ میں سے ہے۔مثلاً بعض صحابہؓ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمر j وغیرہ حج کے موقع پر وادی 'مُحَصَّب' یعنی مقام 'ابطح' میں قیام کرتے تھے۔(۱۳۴) اور اس قیام کو یہ صحابہؓ حج کی سنن میں سے شمار کرتے تھے' کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے بھی حج کے دوران اس جگہ قیام کیا تھا۔لیکن حضرت عائشہ k اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس جگہ آپؐ کے قیام کو اُمورِ عادیہ میں سے شمار کرتے تھے اور اس کو سنت نہیں سمجھتے تھے۔جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں' حضرت عائشہ k فرماتی ہیں:

كَانَ نُزُوْلُ الْاَبْطَحِ لَيْسَ بِسُنَّةٍ' اِنَّمَا نَزَلَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِاَنَّهُ كَانَ اَسْمَحَ لِخُرُوْجِهِ اِذَا خَرَجَ(۱۳۵)

''مقام 'ابطح' میں قیام سنت نہیں ہے' کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس جگہ قیام اس لیے کیا تھا کہ آپ کے لیے اس مقام سے نکلنے میں آسانی تھی''۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) اور ((خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ)) کے بیان میں بھی آپؐ کے تمام افعال ایک درجے کے نہیں ہیں۔بعض افعال ان میں سے فرائض کے درجے کے ہیں اور بعض سنن کے درجے کے ہیں۔مثلاً وادی 'مُحَصَّبْ' کا قیام اگر بعض صحابہؓ نے کیا بھی ہے تو اس کو فرض یا واجب سمجھ کر نہیں بلکہ مستحب سمجھ کر کیا ہے اور معروف مذاہب میں سے کسی بھی مذہب کے ماننے والوں کے ہاں یہ قیام حج کے فرائض یا واجبات میں سے نہیں ہے۔شوافع اور مالکیہ کے نزدیک یہ مستحب ہے جبکہ باقی فقہاء کے نزدیک مستحب بھی نہیں ہے۔اسی طرح نماز میں سورۃ الفاتحہ سے پہلے 'بِسم اللّٰہ' پڑھنے کو کسی بھی فقیہہ نے فرض قرار نہیں دیا' حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں 'بِسم اللّٰہ' پڑھی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ جن فرائض میں صرف فرض کی ادائیگی پر زور دیا گیا ہے اور اس کے طریقے کو لازم نہیں کیا گیا تو اس کا طریقہ بیان میں شامل نہیں ہے اور یہ عموماً ایسے فرائض میں ہے جن کی ادائیگی کے

طریقے میں حالات وزمانے کی تبدیلی کو بہت زیادہ عمل دخل حاصل تھا' جیسا کہ جہاد وقتال اور اعلائے کلمۃ اللہ کا معاملہ ہے۔ اقامت دین ایک دینی فریضہ ہے اور اس کی ادائیگی کا طریقہ سنت نبوی سے ملتا ہے تو کیا اس فریضے کی ادائیگی میں آپ کا ہر ہر فعل فرض کے درجے میں ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اقامت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے فریضے کی ادائیگی کے دوران آپ ﷺ سے صادر ہونے والے متعدد افعال بھی اُن اُمورِ عادیہ سے تعلق رکھتے ہیں' جنہیں آپؐ نے کسی ضرورت کے تحت کیا نہ کہ بطور تشریع کے کیا ہے' جیسا کہ آپ ﷺ نے نماز میں امامہ بنت زینب کو اٹھایا یا اونٹ پر بیٹھ کر بیت اللہ کا طواف کیا تو یہ نماز یا حج کے فریضے کا بیان یعنی وضاحت نہیں ہے بلکہ یہ اُمورِ عادیہ ہیں۔ اسی طرح اقامت دین کے فریضے کی ادائیگی میں آپ ﷺ کا ہجرت کرنا' یہودیوں سے معاہدہ کرنا (میثاق مدینہ)' مشرکین سے صلح کرنا (صلح حدیبیہ)' اپنے دفاع کے لیے خندق کھودنا' منافقین مثلاً عبداللہ بن اُبی وغیرہ کو قتل نہ کرنا' باوجود یکہ ان کا کفر مشرکین مکہ کے کفر سے بڑھ کر تھا اور ان کے دائمی جہنمی ہونے کی وعید قرآن نے سنا دی تھی وغیرہ' یہ ضرورتاً' مصلحتاً اور عادتاً تھا نہ کہ یہ اقامت دین کے فریضے کے طریقے کی ادائیگی کا بیان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب چند ایک مواقع پر بعض صحابہؓ نے بعض منافقین کو قتل کرنے کی دربار رسالت سے اجازت چاہی تو آپؐ نے یہ نہیں کہا کہ یہ مسلمان ہیں اور ان کا خون بہانا ہم پر حرام ہے' بلکہ آپؐ نے جواباً یہ فرمایا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ محمد ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا ہے؟ اقامت دین کے طریقے کے لزوم کے بارے میں ہم مضمون کے شروع میں بھی کچھ بحث کر چکے ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی امر استحباب یا اباحت کے درجے میں ہوگا تو اس امر کا بیان جب رسول اللہ ﷺ اپنے کسی فعل سے کریں گے تو آپ کی ایسی سنت بھی مستحب یا مباح کا درجہ رکھے گی' جیسا کہ علامہ آمدیؒ نے 'الاحکام فی اُصول الاحکام' میں لکھا ہے۔ مثلاً آپ ﷺ نے حکم دیا: ((إِذَا انْتَعَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَاْ بِالْيَمِيْنِ)) (۱۳۶) یعنی جب تم میں کوئی جوتا پہنے تو پہلے دایاں جوتا پہنے۔ اب یہ حکم استحباب کے لیے ہے لہٰذا اس امر کا بیان یعنی وضاحت جب آپؐ کے فعل سے ہوگی تو آپؐ کا وہ فعل بھی مستحب ہوگا۔ علامہ آمدیؒ نے اس ساری بحث کو مختصر انداز میں یوں بیان کیا ہے:

واما ما عرف كون فعله بيانا لنا فهو دليل من غير خلاف فذلک إما لصريح مقاله كقوله صلوا كما رأيتمونى أصلى و خذوا عنى مناسككم أو بقرائن الأحوال و ذلک كما إذا ورد لفظ مجمل أو عام أريد به الخصوص أو مطلق أريد به التقييد و لم يبينه قبل الحاجة إليه ثم فعل عند الحاجة فعلا صالحا للبيان فإنه يكون بيانا حتى لا يكون مؤخرا للبيان عن وقت الحاجة وذلک كقطعة يد السارق من الكوع بيانا لقوله تعالى فاقطعوا أيديهما و كتيممه إلى المرفقين بيانا لقوله فامسحوا بوجوهكم و أيديكم و نحوه والبيان تابع للمبين فى الوجوب والندب و الإباحة (۱۳۷)

''آپ ﷺ کا وہ فعل جو ہمارے لیے بیان یعنی وضاحت ہوگا' وہ ہمارے حق میں دلیل ہوگا اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اور آپ ﷺ کا ایسا فعل یا تو آپؐ کے کسی صریح حکم کی وجہ سے ہمارے لیے بیان ہوتے ہوئے حجت ہوگا' جیسا کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو ویسے تم بھی نماز پڑھو'' اور آپؐ کا فرمان ہے: ''مجھ سے حج کے مناسک سیکھ لو''۔ یا پھر آپ ﷺ کا فعل قرائن واحوال کی وجہ سے بیان ہوگا جیسا کہ کوئی لفظ عام تھا لیکن اس سے مراد خاص تھی یا لفظ مطلق تھا لیکن اس سے مراد مقید تھی اور آپؐ نے اس لفظ کی مراد کو ضرورت سے پہلے واضح نہیں کیا تھا' پھر جب ضرورت پڑی تو آپؐ نے کوئی کام کیا جو کہ بیان بننے کی صلاحیت رکھتا تھا' لہٰذا آپ کا وہ فعل بیان ہوگا اور آپؐ اس بیان کو ضرورت کے وقت سے زیادہ مؤخر کرنے والے نہ ہوں۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا چور کا ہاتھ کلائی سے کاٹنا' اللہ کے حکم ''پس تم ان دونوں کے ہاتھ کاٹو'' کا بیان ہے۔ اسی طرح آپ کا کہنیوں تک تیمّم کرنا اللہ کے حکم ''پس تم اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرلو'' کا بیان ہے' اور اسی طرح اور بھی آیات ہیں۔ اور بیان وجوب' ندب اور اباحت میں مبیّن کے تابع ہے''۔

عربی زبان میں 'ید' کا لفظ انگلیوں سے لے کے کندھے تک بولا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے فعل سے قرآن کے دونوں مقامات پر لفظ 'ید' کی وضاحت کی ہے اور آپؐ کی یہ عملی وضاحت ان آیات کا بیان ہے۔

(۵) فعلِ متردَّد

بعض اوقات آپ کا فعل اُمورِ شرعیہ سے متعلق ہوتا ہے لیکن آپؐ کے اس فعل کے بارے میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ وہ قرآن کے کسی حکم یا آپؐ کی ہی کسی قولی سنت کا بیان ہے یا نہیں ہے۔ اگر دلائل وقرائن سے یہ بات واضح ہو جائے کہ آپؐ نے یہ کام تقرب اِلی اللہ کی نیت سے کیا ہے تو پھر آپؐ کے ایسے فعل کا کیا حکم ہے' اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ علامہ آمدیؒ اس اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وأما ما لم يقترن به ما يدل على أنه للبيان لا نفيا و لا إثباتا فأما أن يظهر فيه قصد القربة فقد اختلفوا فيه فمنهم من قال أن فعله عليه السلام محمول على الوجوب فى حقه و فى حقنا كابن سريج و الأصطخرى وابن أبى هريرة وابن خيزان والحنابلة وجماعة من المعتزلة ومنهم من صار إلى أنه للندب وقد قيل أنه للشافعى وهو اختيار إمام الحرمين و منهم من قال إنه للإباحة و هو مذهب مالک ومنهم من قال بالوقف و هومذهب جماعة من أصحاب الشافعى كالسيرفى والغزالى وجماعة من المعتزلة.. والمختارأن كل لم يقترن به دليل يدل على أنه

قصد به بيان خطاب سابق فإن ظهر فيه قصد القربة إلى الله تعالى فهو دليل فى حقه السلام على القدر المشترک بين الواجب و المندوب وهو ترجيح الفعل على الترک لا غير و إن الإباحة وهى استواء الفعل والترک فى رفع الحرج خارجة عنه وكذلک عن أمته(۱۳۸)

''اور آپ ﷺ کے وہ افعال جن کے بارے میں نفی یا اثبات میں کوئی دلیل ایسی موجود نہ ہو کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ بیان ہیں یا نہیں تو ایسے افعال کی دو قسمیں ہیں۔ (پہلی قسم تو یہ ہے کہ) آپؐ نے اپنے اس فعل کے ذریعے اللہ کے قرب کا ارادہ کیا ہو۔ آپؐ کے ایسے افعال (یعنی جو بیان نہیں ہیں لیکن آپ ﷺ نے ان کو تقرب الی اللہ کے لیے کیا ہے) کی شرعی حیثیت کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ اب سریجؒ، اصطخریؒ، ابن ابی ہریرہ، ابن خیران، حنابلہ اور معتزلہ کی ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ آپ ﷺ کے ایسے افعال آپؐ اور اُمت دونوں کے لیے وجوب کا درجہ رکھتے ہیں۔ علماء کا دوسرا قول یہ ہے کہ آپؐ کے ایسے افعال مندوب ہیں اور کہا گیا ہے کہ یہ امام شافعیؒ کا موقف ہے، امام الحرمین نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ آپؐ کے ایسے افعال مباح ہیں اور چوتھا توقف کا ہے، اس کو شوافع کی ایک جماعت امام سیرفیؒ اور امام غزالیؒ وغیرہ نے اختیار کیا ہے اور معتزلہ کی ایک جماعت کا بھی یہی نقطہ نظر ہے... ان اقوال کے بالمقابل بہترین قول یہ ہے کہ آپ ﷺ کے وہ افعال جن کے کسی سابق خطاب کے بیان ہونے پر کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے اور آپؐ نے ان افعال کے ذریعے اللہ کے قرب کا قصد کیا ہے تو آپ کے ایسے افعال آپؐ کے حق میں واجب ہوں گے یا مندوب، اور یہ ترکِ فعل پر فعل کو ترجیح دینا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اباحت جو کہ رفع حرج کے لیے کسی کام کو کرنے اور نہ کرنے کے درمیان برابری کا نام ہے، آپؐ اور آپؐ کی اُمت دونوں سے خارج ہے''۔

ڈاکٹر وہبۃ الزحیلی نے بھی ''اصول الفقہ الاسلامی'' میں علامہ آمدی کے اس موقف کو ترجیح دی ہے کہ آپؐ کے وہ افعال جن میں آپؐ نے تقرب الی اللہ کی نیت کی ہے وہ اُمت کے حق میں واجب ہوں گے یا مندوب ہوں گے، نہ کہ مباح، چاہے آپؐ کا وہ فعل بظاہر کسی اَمر کا بیان یعنی وضاحت نہ بھی معلوم ہوتا ہو۔ علامہ آمدیؒ نے باقی اقوال کے قائلین کے دلائل کا بیان اور ان کا کافی وشافی رد اپنی کتاب 'الاحکام' میں کر دیا ہے، تفصیل کے لیے اس کتاب کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

(۶) فعل برائے بیانِ جواز

بعض اوقات آپ ﷺ کا فعل امور شرعیہ سے متعلق ہوتا ہے لیکن اس فعل سے آپؐ کا مقصود صرف یہ بتلانا ہوتا ہے کہ یہ کام جائز ہے نہ کہ آپؐ اس فعل کو ثواب کی نیت یا درجات کی بلندی کے لیے کرتے ہیں۔ مثلاً ایک روایت کے الفاظ ہیں:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصْبِحُ جُنُبًا مِنْ غَيْرِ حُلُمٍ ثُمَّ يَصُوْمُ(۱۳۹)

''اللہ کے رسول ﷺ صبح اس حال میں کرتے تھے کہ آپؐ جنبی ہوتے تھے اور آپ کی یہ جنابت احتلام سے نہ ہوتی تھی۔ پھر آپؐ اسی حالت میں (بغیر غسل کیے) روزہ رکھ لیتے تھے''۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ حالت جنابت میں روزہ رکھنا ایک ایسی سنت ہے جو کہ باعث اجر وثواب ہے اور اس سے آخرت میں درجات بلند ہوتے ہیں تو بلاشبہ یہ شخص غلطی پر ہے۔شارحین حدیث نے اس حدیث کی تشریح میں اس عمل کو جائز قرار دیا ہے' نہ کہ مستحب کہا ہے۔مستحب یہی ہے کہ انسان کو اگر غسل کی حاجت ہو تو طلوع فجر سے پہلے غسل کر لے۔اور اگر کسی وجہ سے طلوع فجر سے پہلے غسل نہ کر سکا تو اب سحری کھا کر روزہ رکھے اور طلوع فجر کے بعد غسل کر لے۔آپ ﷺ کا یہ فعل امت کے لیے آسانی پیدا کرنے اور ایک جائز شرعی امر بتلانے کے لیے تھا نہ کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ یا عبادت کا کوئی طریقہ بتلانا آپؐ کا مقصود تھا۔یہ واضح رہے کہ مباح کو اصولیین نے حکم شرعی کی ایک قسم قرار دیا ہے' لیکن مباح کی تعریف میں یہ بات داخل ہے کہ یہ وہ فعل ہے کہ جس کے کرنے اور نہ کرنے پر کوئی اجر وثواب یا سزا وعذاب نہیں ہوتا ہے۔علامہ آمدیؒ نے آپؐ کے ایسے افعال کو اس اصول کے تحت بیان کیا ہے:

وأما ما لم يظهر فيه قصد القربة فقد اختلفوا أيضا فيه على نحو اختلافهم فيما ظهر فيه قصد القربة غير أن القول بالوجوب و الندب فيه أبعد مما ظهر فيه قصد القربة والوقف و الاباحة أقرب..... والمختار ان كل لم يقترن به دليل يدل على أنه قصد به بيان خطاب سابق فإن ظهر فيه قصد القربة إلى الله تعالى فهو دليل فى حقه السلام على القدر المشترک بين الواجب و المندوب وهو ترجيح الفعل على الترک لا غير وإن الإباحة وهى استواء الفعل والترک فى رفع الحرج خارجة عنه و كذلک عن أمته وما لم يظهر فيه قصد القربة فهو دليل فى حقه على القدر المشترک بين الواجب والمندوب و المباح وهو رفع الحرج عن الفعل لا غير و كذلک عن أمته(۱۴۰)

''اور آپ ﷺ کے وہ افعال جن میں آپؐ نے تقرب الی اللہ کا قصد نہ کیا ہے تو ان افعال کی شرعی حیثیت کے بارے میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔آپؐ کے افعال کی اس قسم میں وجوب اور استحباب کا قول بعید ہے اس قسم کی نسبت سے کہ جس میں آپؐ نے تقرب الی اللہ کا قصد کیا ہے۔جبکہ اباحت اور وقف کا قول زیادہ صحیح ہے...اور بہترین قول یہ ہے کہ آپ ﷺ کے وہ افعال جن کے کسی سابق خطاب کے بیان ہونے پر کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے اور آپؐ نے ان افعال کے ذریعے اللہ کے قرب کا قصد کیا ہے تو آپؐ کے ایسے افعال آپ ﷺ کے حق میں واجب ہوں گے یا مندوب'

اور یہ ترکِ فعل پر فعل کو ترجیح دینا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اباحت جو کہ رفع حرج کے لیے کسی کام کو کرنے اور نہ کرنے کے درمیان برابری کا نام ہے' آپؐ اور آپؐ کی اُمت دونوں سے خارج ہے۔ اور جن افعال میں آپ ﷺ نے تقرب الی اللہ کا قصد نہیں کیا ہے وہ آپؐ کے حق میں واجب' مستحب یا مباح ہو سکتے ہیں اور یہ فعل سے حرج کو دور کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے اور اسی طرح کا حکم آپ کی اُمت کے بارے میں بھی ہے''۔

(۷) تجربہ ومشاہدہ سے متعلقہ افعال

اللہ کے رسول ﷺ کے وہ افعال جو کہ آپؐ کے ذاتی تجربے اور مشاہدے سے متعلق ہیں وہ بھی ہمارے لیے ایسی سنت نہیں ہیں کہ جس کا اتباع لازم اور باعث اجر وثواب ہو۔ ڈاکٹر عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

ما صدر عنه بمقتضى خبرته الانسانية فى الأمور الدنيوية' مثل: تنظيم الجيوش' و القيام بما يقتضيه تدبير الحرب' و شؤون التجارة و نحو ذلک. فهذه الأفعال لا تعتبر تشريعا للأمة' لأن مبناها التجربة لا الوحى' والرسول ﷺ لم يلزم المسلمين بها و لم يعتبرها من قبيل تشريع الأحكام(۱۴۱)

''اللہ کے رسول ﷺ کے وہ افعال جو کہ آپؐ سے امور دنیویہ میں انسانی خبروں اور تجربات سے حاصل شدہ علم کی بنا پر صادر ہوئے ہیں' مثلاً لشکروں کو منظم کرنا' جنگی معاملات کی تدبیر اور تجارت سے متعلقہ معاملات وغیرہ' تو یہ تمام افعال ایسے ہیں جو کہ اُمت کے لیے شریعت نہیں ہیں' کیونکہ آپؐ کے ان امور کی بنیاد وحی کے علم کی بجائے انسانی تجربات کے علم پر ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے ایسے افعال کو اُمت کے لیے لازم بھی قرار نہیں دیا ہے اور نہ ہی ان کو شرعی احکام میں شمار کیا ہے''۔

علامہ احمد العدویؒ رسول اللہ ﷺ کے اس قسم کے افعال کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ثبت فى الصحيح: أن النبى ﷺ فى يوم بدر جاء إلى أدنى ماء من بدر فنزل عنده' فقال الحباب بن المنذر: يا رسول الله أرأيت هذا المنزل' أ منزلا أنزلكه الله ليس لنا أن نتقدمه و لا نتأخر عنه' أم هو الرأى و الحرب و المكيدة؟ قال: بل هو الرأى و الحرب و المكيدة. فقال: يا رسول الله ليس هذا المنزل' فانهض بالناس نأتى أدنى ماء من القوم فننزله' ثم نغور ما وراءه إلخ ما قال' فقال له النبى ﷺ: لقد أشرت بالرأى و عمل برأيه' و هذا يدل على أن محض الفعل لا يفيد أنه قربة. ووجه الدلالة أن الصحابة لا يرون أن كل فعل للنبى ﷺ عن وحى من الله تعالى' بل منه ما هو مستند إلى وحى كالفعل الذى يظهر فيه قصد القربة'

ومنه ما هو مبنى على رأى و اجتهاد، ولذلک سأل الحباب بن المنذر بجمع من الصحابة عن المنزل الذى نزل النبیﷺ هل النزول فيه عن وحی حتى يذعنوا له، أو عن رأى و اجتهاد حتى يشاركوه فيه......ولو كان فعل الرسول لا يكون إلا عن وحی ما كان لذلک السؤال وجه، وما صح منه موافقتهم و ترک الوحی[١٤٢]

''صحیح روایت سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ کے رسولﷺ نے بدر والے دن بدر کے میدان میں 'عدوۃ دنیا' کے قریب پڑاؤ ڈالا تو حضرت حباب بن منذرؓ نے سوال کیا: اے اللہ کے رسولﷺ! کیا یہاں پر پڑاؤ ڈالنا آپؐ کی ذاتی رائے ہے' یا آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے یہاں قیام کا حکم دیا ہے اور ہمارے لیے اس مقام سے آگے یا پیچھے ہونا جائز نہیں ہے' یا یہ کوئی جنگی چال اور تدبیر وغیرہ ہے؟ آپﷺ نے فرمایا: یہ ایک جنگی چال اور تدبیر ہے۔ حضرت حبابؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولﷺ! پھر یہ ہمارے ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے' بلکہ آپ لوگوں کو اٹھائیں' ہم مشرکین مکہ کے سب سے قریبی پانی کے پاس پڑاؤ ڈالتے ہیں تا کہ ہم مشرکین اور ان کے پانی کے درمیان حائل ہو جائیں ...آپ نے ان کی بات سن کر کہا: حبابؓ نے اچھی رائے دی ہے اور پھر آپؐ نے ان کی رائے پر عمل کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپﷺ کا محض فعل اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ آپؐ نے وہ کام تقرب الی اللہ کے لیے کیا ہو۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ j آپؐ کے ہر فعل کو وحی نہیں سمجھتے تھے بلکہ آپؐ کے بعض افعال وحی پر مبنی ہوتے تھے مثلاً وہ افعال کہ جن میں آپؐ نے اللہ کے قرب کا قصد کیا ہے اور بعض افعال آپؐ کا اجتہاد اور ذاتی رائے ہوتی تھی۔ اسی لیے حضرت حبابؓ نے صحابہؓ کی موجودگی میں آپؐ سے یہ سوال کیا تھا کہ آپؐ کا اس جگہ پڑاؤ ڈالنا وحی کی وجہ سے تھا کہ جس پر انہیں سر تسلیم خم کر دینا چاہیے یا آپؐ کی ذاتی رائے اور اجتہاد تھا کہ جس میں صحابہؓ بھی آپؐ کو مشورہ دے سکتے تھے...اگر اللہ کے رسولﷺ کا ہر فعل وحی ہوتا تو صحابیؓ کبھی بھی یہ سوال نہ کرتا اور نہ ہی آپ وحی کو چھوڑ کر ایک صحابیؓ کی رائے پر عمل کرتے''۔

یہ واضح رہے کہ اللہ کے رسولﷺ کے اجتہاد کو اگر اللہ کی تصویب حاصل ہو جائے تو پھر وہ وحی بن جاتا ہے۔ مثلاً آپؐ نے کسی دینی مسئلے میں اجتہاد کیا' اب اللہ کی طرف سے آپؐ کے اس اجتہاد پر خاموشی ہے تو آپ کا یہ اجتہاد اللہ کی تقریر کہلائے گا اور وحی الٰہی ہوگا۔

ابن العربیؒ نے 'احکام القرآن' میں اس روایت کو 'ثابت' کہا ہے۔[١٤٣] جبکہ علامہ البانیؒ نے اسے 'فقہ السیرۃ' میں 'ضعیف' کہا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ روایت بطور حدیث ضعیف ہے کیونکہ حدیث کی جانچ پڑتال کے اصولوں پر پوری نہیں اترتی لیکن سیرت کے ایک واقعے کے طور پر ثابت ہے جیسا کہ امام ابن کثیرؒ نے بھی اس کو قابل استدلال قرار دیا ہے۔

(۸) افعالِ مختلفہ یا متنوعہ

بعض اوقات ایک ہی مسئلے میں آپؐ سے دو یا دو سے زائد افعال مروی ہوتے ہیں جبکہ کوئی امتی ان میں سے صرف ایک فعل کو سنت سمجھ رہا ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ فرض نماز سے فارغ ہونے کے بعد دائیں طرف سے پھرتے ہوئے صحابہؓ کی طرف رخ کرتے تھے۔ حضرت انس h فرماتے ہیں:

اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَنْصَرِفُ عَنْ یَمِیْنِہٖ(۱۴۴)

''اللہ کے نبی ﷺ (فرض نماز سے فارغ ہونے کے بعد) دائیں طرف پھرتے تھے''۔

جبکہ حضرت عبداللہ بن مسعود h کی ایک روایت ہے:

لاَ یَجْعَلَنَّ اَحَدُکُمْ لِلشَّیْطَانِ مِنْ نَفْسِہٖ جُزْءًا لاَ یَرٰی اِلَّا اَنَّ حَقًّا عَلَیْہِ اَنْ لَا یَنْصَرِفَ اِلَّا عَنْ یَمِیْنِہٖ اَکْثَرُ مَا رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَنْصَرِفُ عَنْ شِمَالِہٖ(۱۴۵)

''تم میں کوئی ایک اپنے نفس میں شیطان کا کوئی حصہ اس طرح مقرر نہ کر لے کہ وہ اپنے اوپر یہ لازم ٹھہرا لے کہ وہ نماز کے بعد دائیں طرف سے ہی پھرے۔ میں نے (نماز کے بعد) اکثر و بیشتر اللہ کے رسول ﷺ کو بائیں طرف پھرتے ہوئے دیکھا ہے''۔

دونوں روایات میں کوئی تعارض نہیں ہے' بلکہ ہر صحابیؓ نے اپنے مشاہدے کو بیان کیا ہے' لہٰذا فرض نماز سے فارغ ہو کر دائیں اور بائیں دونوں طرف سے پھرنا سنت ہے اور صرف دائیں پھرنے کو ہی سنت سمجھتے ہوئے اس پر لزوم اختیار کرنا درست نہیں ہے۔

اسی طرح حضرت عائشہ k سے روایت ہے:

رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَشْرَبُ قَائِمًا وَقَاعِدًا وَیُصَلِّیْ حَافِیًا وَمُنْتَعِلًا وَیَنْصَرِفُ عَنْ یَمِیْنِہٖ وَعَنْ شِمَالِہٖ(۱۴۶)

''میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر پانی پیتے دیکھا ہے اور آپؐ کو جوتے پہن کر اور اُتار کر نماز پڑھتے دیکھا ہے اور آپؐ کو نماز کے بعد دائیں اور بائیں پھرتے دیکھا ہے''۔

علامہ البانیؒ نے اس حدیث کی سند کو صحیح کہا ہے۔ اس حدیث میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا بھی اللہ کے رسول ﷺ کی سنت ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہی معروف ہے کہ بیٹھ کر ہی پانی پینا چاہیے اور یہی سنت ہے' لیکن یہ درست نہیں ہے۔ حضرت نزال بن سبرہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے کوفہ میں ایک مقام پر کھڑے ہو کر پانی پیا اور کہا:

اِنَّ نَاسًا یَکْرَہُ اَحَدُھُمْ اَنْ یَشْرِبَ وَھُوَ قَائِمٌ وَاِنِّیْ رَأَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ فَعَلَ کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ فَعَلْتُ(۱۴۷)

''بعض لوگ کھڑا ہو کر پانی پینے کو مکروہ (ناپسندیدہ) سمجھتے ہیں' جبکہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا ہے جیسا کہ میں نے کیا ہے''۔

اسی طرح 'موطأ' میں صحیح سند سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر i اور حضرت عبداللہ بن عمر i کھڑے ہو کر پانی پی لیتے تھے' جبکہ حضرت عائشہ k اور حضرت سعد بن ابی وقاص h کھڑے ہو کر پانی پینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح کا عمل حضرت عمر' حضرت عثمان اور حضرت علی j سے بھی 'موطأ' میں مروی ہے۔(۱۴۸)

بلکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے تو یہاں تک مروی ہے کہ ہم صحابہؓ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں کھڑے کھڑے اور چلتے پھرتے کھانا بھی کھا لیتے تھے' جبکہ آج کل اس فعل کو مغربی تہذیب کی نقالی کا نام دیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر i فرماتے ہیں:

كُنَّا نَاْكُلُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَنَحْنُ نَمْشِيْ وَنَحْنُ قِيَامٌ(۱۴۹)

''ہم اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں چلتے چلتے اور کھڑے کھڑے کھا پی لیتے تھے''۔

علامہ البانیؒ نے اس روایت کو 'صحیح' کہا ہے(۱۵۰) جبکہ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے 'حسن' قرار دیا ہے(۱۵۱)۔ امام ترمذیؒ نے بھی اس کو 'صحیح' کہا ہے۔(۱۵۲)

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جن روایات میں اللہ کے رسول ﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع کیا ہے یا ڈانٹا ہے یا قے کرنے کا حکم دیا ہے تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے احادیث میں ترجیح کا طریقہ کار اختیار کیا اور یہ کہا کہ جن احادیث میں کھڑے ہو کر پانی پینے کا بیان ہے وہ ان احادیث کے مقابلے میں سند کے اعتبار سے راجح ہیں جن میں کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع کیا گیا ہے۔ امام ابوبکر الأثرم کا یہی قول ہے۔ بعض علماء نے ان احادیث کے بظاہر تعارض کو حل کرنے کے لیے نسخ کا قول اختیار کیا ہے۔ امام ابن شاہینؒ کے مطابق نہی والی احادیث صحیح ہونے کے باوجود منسوخ ہیں جبکہ امام ابن حزمؒ نے جواز والی احادیث کو منسوخ کہا ہے۔ بعض علماء نے دونوں احادیث کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے' لہٰذا علماء کے ایک گروہ کے نزدیک نہی والی احادیث میں نہی کراہت تنزیہی کے لیے ہے' لہٰذا کھڑے ہو کر پانی پینا جائز امر ہے' کیونکہ مکروہ کا ارتکاب باعث گناہ نہیں ہے۔ یہ رائے امام خطابی' امام طحاوی' امام ابن جریر طبری' امام نووی' علامہ ابن حجر عسقلانی اور ابن بطال n وغیرہ کی ہے۔ علماء کے دوسرے گروہ کی جمع کے مطابق جن احادیث میں کھڑے ہو کر پانی پینے کا جواز ہے وہ عذر کے سبب سے ہے۔ یہ امام ابن تیمیہؒ کی رائے ہے۔ تیسرے گروہ کی جمع کے مطابق نہی والی روایات میں نہی کسی شرعی حکم کے طور پر وارد نہیں ہوئی بلکہ آپؐ نے طبی نقطہ نظر سے کھڑے ہو کر پانی پینے کو نقصان دہ سمجھتے ہوئے اس طرح پانی پینے سے منع کیا تھا۔ سوائے امام ابن تیمیہؒ کے قول کے ان تمام اقوال کو امام ابن حجرؒ نے 'فتح الباری' میں نقل کیا ہے۔ امام صاحبؒ کا قول 'مجموع الفتاویٰ' میں موجود ہے۔

ہمارے نزدیک یہ آخری رائے درست ہے۔اللہ کے رسول ﷺ کی وفات کے بعد جلیل القدر صحابہ j کا خاص طور پر خلفائے راشدین اور حضرت عبداللہ بن عمر i کا کھڑے ہوکر پانی پینا یہ واضح کرتا ہے کہ امام ابن حزمؒ کا نسخ کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہؓ بھی کھڑے ہوکر پانی پی لیتے تھے' لہٰذا عذر والا قول درست نہیں ہے' کیونکہ عذر تو کبھی کبھی ہوتا ہے۔علاوہ ازیں حضرت علیؓ کی روایات سے کراہت والے قول کا غلط ہونا بھی واضح ہوتا ہے' کیونکہ حضرت علیؓ نے یہ کہہ کر کھڑے ہوکر پانی پیا کہ لوگ اس کو مکروہ سمجھتے ہیں' یعنی ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ مکروہ یا دین میں ناپسندیدہ چیز نہیں ہے۔علاوہ ازیں حضرت علیؓ نے بغیر کسی عذر کے کھڑے ہوکر پانی پیا تھا۔امام ابوبکر الاثرمؒ کے نزدیک جواز والی احادیث راجح جبکہ نہی والی مرجوح ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ مرجوح حدیث پر عمل نہیں ہوتا' لیکن صحابہؓ نے نہی والی احادیث پر بھی عمل کیا ہے۔یہی معاملہ امام ابن شاہینؒ کے اس دعویٰ کا ہے کہ نہی والی احادیث منسوخ ہیں' جبکہ صحابہؓ نے آپ ﷺ کی وفات کے بعد نہی والی روایات پر بھی عمل کیا ہے۔اس لیے 'موطأ' میں حضرت عائشہؓ اور حضرت سعد بن وقاصؓ سے مروی ہے کہ وہ کھڑے ہوکر پانی پینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے۔پس بظاہر یہی قول درست معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے کھڑے ہوکر پانی پینے سے شرعی حکم کے طور پر منع نہیں کیا بلکہ اس کے بعض طبی نقصانات کی وجہ سے اُمت کو اس طرح پانی پینے سے سختی سے منع فرمایا جیسا کہ ایک باپ بعض اوقات اپنے بیٹے کو کسی دنیاوی معاملے میں نقصان سے بچانے کے لیے ڈانٹ ڈپٹ کے انداز میں کوئی حکم جاری کرتا ہے اور اس میں اصل وجہ باپ کی اپنے بیٹے سے پدرانہ محبت ہوتی ہے نہ کہ کوئی شرعی حکم۔یہی محبت آپ ﷺ کو اپنی اُمت سے بھی تھی۔اسی طرح ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَأْتِي مَسْجِدَ قُبَاءٍ كُلَّ سَبْتٍ مَاشِيًا وَرَاكِبًا' وَكَانَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ يَفْعَلُهُ(۱۵۳)

''اللہ کے رسول ﷺ ہر ہفتے کے دن مسجد قبا میں پیدل اور سوار دونوں طرح آتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمر i بھی ایسا ہی کرتے تھے''۔

(۹) رسول اکرم ﷺ کی نظر میں بعض پسندیدہ افعال

بعض اوقات رسول اللہ ﷺ ایک کام بطور عبادت کرنے کا ارادہ کرتے' لیکن آپ ﷺ وہ کام کسی سبب سے بالفعل نہیں کرتے تھے' تاہم آپ ﷺ کی یہ خواہش ہوتی کہ آپ ﷺ وہ کام کریں۔اس معاملے میں اگرچہ آپ ﷺ نے ایک کام نہیں کیا لیکن جس کے کرنے کی اللہ کے رسول ﷺ نے خواہش کی تھی تو وہ کام اُمت کے لیے مستحب ہوگا۔صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے رمضان کے مہینے میں صرف تین دن تراویح پڑھائی تھے اور چوتھے دن صحابہؓ آپ کا انتظار کرتے رہے لیکن آپ ﷺ تراویح پڑھانے کے لیے اپنے

حجرے سے باہر تشریف نہ لائے۔ فجر کی نماز کے بعد آپؐ نے صحابہؓ کو بتلایا:

((فَاِنَّـهُ لَمْ يَخْفَ عَلَيَّ شَانُكُمُ اللَّيْلَةَ وَلٰكِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تُفْرَضَ عَلَيْكُمْ صَلَاةُ اللَّيْلِ فَتَعْجِزُوْا عَنْهَا)) (١٥٤)

''تمہاری رات کی کیفیت مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے' لیکن مجھے یہ اندیشہ تھا کہ تم پر رات کی نماز (یعنی تراویح) فرض نہ کر دی جائے اور تم اس کی ادائیگی سے عاجز آجاؤ (اور گناہ گار ہو)''۔

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

((فَلَمْ يَمْنَعْنِيْ مِنَ الْخُرُوْجِ اِلَيْكُمْ اِلَّا اَنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تُفْرَضَ عَلَيْكُمْ)) (١٥٥)

''اور مجھے تراویح کی نماز کے لیے اپنے حجرے سے باہر نکلنے کے لیے سوائے اس چیز کے اور کسی امر نے نہیں روکا کہ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ وہ تم پر فرض نہ کر دی جائے''۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے صرف تین دن تراویح کی جماعت کروائی ہے' باقی دنوں میں آپؐ اور صحابہؓ نے تراویح کی نماز انفرادی طور پر پڑھی ہے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی وفات تک معاملہ اسی طرح رہا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ آپ ﷺ کی سنت تو صرف تین دن جماعت کے ساتھ تراویح کی نماز پڑھنا ہے تو وہ غلطی پر ہے' کیونکہ حضرت عمر h کے زمانے میں صحابہ مکمل رمضان میں تراویح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ لہٰذا زیادہ افضل یہ ہے کہ تمام رمضان میں تراویح کی نماز باجماعت ادا کی جائے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں عبدالرحمٰن بن عبدالقاریؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت عمرؓ کے ساتھ مسجد نبوی میں گیا تو حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ صحابہؓ الگ الگ ٹکڑیوں میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ بعض صحابہؓ اکیلے نماز پڑھ رہے تھے' جبکہ بعض کچھ دوسروں کو نماز پڑھا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ منظر دیکھا تو سب کو جمع کر کے ایک جماعت بنا دیا اور حضرت اُبی بن کعبؓ کو قاری مقرر کر دیا۔ اگلی رات جب حضرت عمرؓ دوبارہ مسجد میں تشریف لائے تو آپؓ نے صحابہؓ کو ایک جماعت میں نماز پڑھتے دیکھ کر کہا:

نِعْمَ الْبِدْعَةُ هٰذِهٖ' وَالَّتِيْ يَنَامُوْنَ عَنْهَا اَفْضَلُ مِنَ الَّتِيْ يَقُوْمُوْنَ' يُرِيْدُ آخِرَ اللَّيْلِ' وَكَانَ النَّاسُ يَقُوْمُوْنَ اَوَّلَهٗ (١٥٦)

''یہ کیا ہی خوب بدعت (یعنی نیا کام) ہے! اور جو لوگ سو رہے ہیں وہ ان قیام کرنے والوں سے افضل ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی مراد وہ سونے والے لوگ تھے جو آخر رات میں قیام کرتے تھے اور عام لوگ اول وقت میں قیام کرتے تھے''۔

بعض اوقات ایسے کام کو کرنا جائز نہیں ہوتا جس کا اللہ کے رسول ﷺ نے ارادہ کیا ہو لیکن آپؐ نے اس کو بالفعل نہ کیا ہو' اور اس کا علم احوال وقرائن سے ہوتا ہے' جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان لوگوں کے

بارے میں جو مسجد میں آ کر جماعت کے ساتھ نماز ادا نہیں کرتے تھے' فرمایا:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَقَدْ ھَمَمْتُ اَنْ آمُرَ بِحَطَبٍ فَیُحْطَبَ ثُمَّ آمُرَ بِالصَّلَاۃِ فَیُؤَذَّنَ لَھَا ثُمَّ آمُرَ رَجُلًا فَیَؤُمَّ النَّاسَ ثُمَّ اُخَالِفَ اِلٰی رِجَالٍ فَاُحَرِّقَ عَلَیْھِمْ بُیُوْتَھُمْ' وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْ یَعْلَمُ اَحَدُھُمْ اَنَّـہٗ یَجِدُ عَرْقًا سَمِیْنًا اَوْ مِرْمَاتَیْنِ حَسَنَتَیْنِ لَشَھِدَ الْعِشَاءَ)) (۱۵۷)

امام نوویؒ نے 'شرح مسلم' میں لکھا ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھنے والوں کو یہ سزا دینا جائز نہیں ہے' کیونکہ آپ ﷺ نے یہ سزا نہیں دی۔ امام نوویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حدیث کا سیاق یہ بتلاتا ہے کہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد منافقین کے بارے میں تھا' کیونکہ صحابہؓ سے یہ بعید ہے کہ وہ ایک یا دو ہڈیوں کو جماعت کی نماز پر ترجیح دیں۔ بعض دوسری روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فجر اور عشاء کی نماز منافقین پر بھاری ہوتی تھی اور اس روایت میں بھی عشاء کی نماز کا تذکرہ ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ نے حطیم کو بھی بیت اللہ میں شامل کرنے کی خواہش کا ظہار کیا تھا لیکن کچھ موانع کی وجہ سے آپ ﷺ نے اس پر عمل نہ کیا۔ اُمت نے بھی آج تک اس فعل پر آپ ﷺ کی خواہش کے باوجود عمل نہیں کیا ہے۔

(۱۰) افعال مبنی بر علت وسبب

بعض اوقات اللہ کے رسول ﷺ ایک کام کسی ضرورت یا سبب سے کرتے تھے' لہٰذا اس مسئلے میں اللہ کے رسول ﷺ کے فعل کی مخالفت زیادہ افضل ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے' حضرت ابوطفیلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس i سے کہا:

اَخْبِرْنِیْ عَنِ الطَّوَافِ بَیْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃِ رَاکِبًا اَسُنَّۃٌ ھُوَ؟ فَاِنَّ قَوْمَکَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّـہٗ سُنَّـۃٌ ' قَالَ صَدَقُوْا وَکَذَبُوا ' قُلْتُ وَمَا قَوْلُکَ صَدَقُوْا وَکَذَبُوْا؟ قَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ کَثُرَ عَلَیْہِ النَّاسُ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مُحَمَّدٌ ھٰذَا مُحَمَّدٌ حَتّٰی خَرَجَ الْعَوَاتِقُ مِنَ الْبُیُوْتِ' قَالَ وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَا یُضْرَبُ النَّاسُ بَیْنَ یَدَیْہِ فَلَمَّا کَثُرَ عَلَیْہِ رَکِبَ وَ الْمَشْیُ وَالسَّعْیُ اَفْضَلُ (۱۵۸)

''مجھے صفا اور مروہ کے درمیان سواری پر طواف کرنے کے بارے میں بتائیں کہ کیا وہ سنت ہے؟ بے شک آپ کی قوم کے لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ایسا کرنا سنت ہے۔ تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا: انہوں نے سچ کہا اور جھوٹ بھی بولا۔ میں نے پھر پوچھا کہ آپ کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ انہوں نے سچ بھی کہا اور جھوٹ بھی بولا؟ انہوں نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ پر لوگوں نے ہجوم کر لیا تھا اور یہ کہہ رہے تھے کہ یہ محمد ﷺ ہیں یہ محمد ﷺ ہیں' یہاں تک کہ بوڑھی عورتیں بھی اپنے

گھروں سے باہر نکل آئیں۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا: لوگ آپؐ کے سامنے ہجوم نہیں کرتے تھے' لیکن جب انہوں نے آپؐ پر اکٹھ کر لیا تو آپؐ نے سوار ہو کر سعی کی' جبکہ پیدل سعی کرنا زیادہ افضل ہے''۔

امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

وهذا الذى قاله ابن عباس مجمع عليه اجمعوا على أن الركوب فى السعى بين الصفا والمروة جائز وإن المشى افضل منه إلا لعذر و اللّٰه أعلم(۱۵۹)

''اور جو بات حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہی ہے اس پر اجماع ہے۔علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ صفا اور مروہ کی سعی کے دوران سوار ہونا جائز ہے لیکن پیدل چلنا زیادہ افضل ہے' سوائے اس کے کہ کوئی عذر لاحق ہو''۔

(۱۱) مقصد سے مربوط فعل

بعض اوقات اللہ کے رسول ﷺ کے ایک فعل میں اصلاً مقصود وہ فعل نہیں ہوتا بلکہ اس فعل سے حاصل ہونے والا نتیجہ ہوتا ہے۔جیسا کہ احادیث میں وارد ہے کہ مسواک کرنا آپ ﷺ کی سنت ہے اور اس سنت کا مقصود منہ کی صفائی ہے۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلسِّوَاکُ مَطْهَرَةٌ لِلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ))(۱۶۰)

''مسواک کرنا منہ کی صفائی کا ذریعہ ہے اور ربّ کی رضا ہے''۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسواک کی سنت میں اصل حکمت طہارت ہے نہ کہ دانتوں پر کوئی لکڑی پھیرنا۔امام طیبیؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ مسواک کی حکمت منہ کی صفائی ہے اور پھر منہ کی صفائی کو اللہ کی رضا قرار دیا گیا ہے۔مسواک عربی زبان کے اعتبار سے اسم آلہ کا وزن بنتا ہے اور اس کا معنیٰ 'مَایُستاک بِهٖ' یعنی جس کے ذریعے کسی چیز کو رگڑا جائے یا مَلا جائے۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں مسواک لکڑی ہی کی ہوتی تھی اور مسواک میں سب سے افضل پیلو کی مسواک ہے' جیسا کہ صحیح روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعود h سے مروی ہے:

كُنْتُ اَجْتَنِیْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ سِوَاكًا مِنَ الْاَرَاكِ(۱۶۱)

''میں اللہ کے رسول ﷺ کے لیے پیلو کی مسواک چنا کرتا تھا''۔

صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق اپنی زندگی کے آخری لمحات میں آپ ﷺ نے کھجور کی تازہ شاخ کو مسواک کے طور پر استعمال کیا تھا جبکہ آپؐ کا سر مبارک حضرت عائشہ k کی گود میں تھا۔بعض علماء نے زیتون کی مسواک کو بھی اس کے درخت کے بابرکت ہونے کی وجہ سے افضل کہا ہے لیکن زیتون کی مسواک کی فضیلت میں وارد شدہ تمام روایات ضعیف ہیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انگلی کے دانتوں پر

پھیرنے سے مسواک کی سنت ادا ہو جاتی ہے؟ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انگلی اگر نرم ہے یعنی اس سے کسی قدر دانتوں کی صفائی ممکن نہیں ہے تو یہ سنت ادا نہ ہوگی' لیکن اگر انگلی سخت اور کھردری ہے تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ احناف' مالکیہ اور ایک روایت کے مطابق حنابلہ کے نزدیک اس سے سنت ادا ہو جائے گی جبکہ شوافع اور حنابلہ کے مشہور موقف کے مطابق سنت ادا نہ ہوگی۔ امام نوویؒ حافظ عراقیؒ اور ابن قدامہؒ نے پہلے مسلک ہی کو ترجیح دی ہے اور ہمارے نزدیک بھی پہلا مسلک درست ہے جس کی دلیل درج ذیل روایت ہے:

اِنَّ رَجُلًا مِّنَ الْاَنْصَارِ مِنْ بَنِیْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ قَالَ : یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اِنَّکَ رَغَّبْتَنَا فِی السِّوَاکِ' فَھَلْ دُوْنَ ذٰلِکَ مِنْ شَیْءٍ؟ قَالَ : ((اِصْبَعَاکَ سِوَاکٌ عِنْدَ وُضُوْئِکَ تَمُرُّھَا عَلٰی اَسْنَانِکَ))(۱۶۲)

''انصار میں بنوعمر بن عوف کے ایک شخص نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ نے ہمیں مسواک کرنے میں رغبت دلائی ہے' تو کیا مسواک کے علاوہ بھی کوئی شے کفایت کر جائے گی؟ تو آپ نے فرمایا: ''تمہاری انگلیاں تمہارے وضو کے وقت تمہاری مسواک ہیں' تم ان کو اپنے دانتوں پر رگڑ لیا کرو''۔

حافظ عراقیؒ نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد اس کے تمام رواۃ کو ثقہ قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت انس h سے مروی ایک روایت ((یُجْزِئُ مِنَ السِّوَاکِ الْاَصَابِعُ)) یعنی انگلیاں تمہیں مسواک کے بالمقابل کفایت کریں گی' بھی ہے' جس کے بعض طرق کو ابن حجر عسقلانیؒ نے صحیح کہا ہے۔(۱۶۳)

مسواک کا مقصد یعنی منہ کی صفائی عصر حاضر میں ٹوتھ پیسٹ اور برش وغیرہ سے بھی پورا ہو جاتا ہے تو کیا اگر کوئی شخص اس نیت سے برش کرے کہ سنت ادا ہو جائے تو اسے سنت کا ثواب ملے گا؟ علماء کی ایک جماعت کا موقف یہ ہے کہ برش کرنے سے بھی سنت کا ثواب ملے گا بشرطیکہ سنت کی ادائیگی کی نیت ہو۔ ڈاکٹر عبداللہ الفقیہ لکھتے ہیں:

و أما عن السواک فالسنة أصلا أن یکون بعود الأراک اللین نظرا لأنه أکثر انفاء و ملائمة للفم و أطیب ریحا. أما إذا حصل الانفاء بغیره أو وجد ما هو أبلغ فی الانفاء' فمن نظر إلی ان المقصود الانفاء فانه یکتفی بالفرشاة و المعجون. ومن نظر إلی أن الأمر تعبدی' وأن السنة لا تحصل إلا بالعود فانه یجعل السواک بالعود سنة. ولعل الراجح ان شاء اللّٰه تعالی أن الفرشاة و المعجون تحصل بهما السنة لأن تنظیفهما للفم وتطهیرهما أبلغ من تطهیر وتنظیف العود. وقد قال بعض أهل العلم بحصول السنة بالسواک بالإصبع والخرقة(۱۶۴)

''جہاں تک مسواک کا معاملہ ہے تو اصل سنت یہی ہے کہ وہ پیلو کی نرم لکڑی کی ہونی چاہیے کیونکہ اس سے منہ کی بدبو اچھی طرح دور ہوتی ہے اور وہ ملائم بھی ہوتی ہے اور خوشبودار بھی۔ اگر اس کے علاوہ کسی اور چیز سے بھی منہ کی صفائی حاصل ہو جائے یا کوئی اور چیز مسواک سے بھی زیادہ اچھی طرح منہ صاف کرنے والی ہو تو جن علماء نے مقصود کو دیکھا تو ان کے نزدیک پیسٹ اور برش وغیرہ بھی مسواک کی جگہ کفایت کرتے ہیں' اور جن علماء نے مسواک کو تعبدی امور میں شمار کیا ہے تو ان کے نزدیک سنت صرف لکڑی کے استعمال میں ہے' لہٰذا ان کے نزدیک لکڑی استعمال کرنا ہی سنت ہے۔ اور راجح مسلک ہمارے نزدیک یہ ہے کہ پیسٹ اور برش وغیرہ سے بھی سنت حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ یہ دونوں لکڑی سے زیادہ اچھی طرح منہ کو صاف اور پاک کرنے والے ہیں۔ بعض سلف صالحین کے نزدیک انگلی اور پرانے کپڑے کو رگڑنے سے بھی مسواک کی سنت حاصل ہو جاتی ہے''۔

اب تو ایسے ٹوتھ پیسٹ بھی آ گئے ہیں جو کہ مسواک کے قدرتی اجزا پر مشتمل ہیں جیسا کہ دبئی سے ''سواک'' کے نام سے مسواک کے قدرتی اجزاء پر مشتمل ایک ٹوتھ پیسٹ بنایا گیا ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ برش کے ساتھ ساتھ مسواک کی سنت کو ترک نہیں کرنا چاہیے' کیونکہ مسواک کرنے کے بہت سے ایسے مواقع سنت سے ثابت ہیں جن میں برش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((لَوْ لَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِیْ لَاَمَرْتُھُمْ بِالسِّوَاکِ مَعَ کُلِّ صَلَاۃٍ))(۱۶۹)

''مجھے اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میں اپنی اُمت کو مشقت میں ڈال دوں گا تو میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا''۔

لہٰذا ہر نماز کے وقت مسواک کرنا سنت ہے۔

بعض صحیح احادیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے کہ جب کتا تمہارے کسی برتن میں اپنا منہ ڈال دے تو تم اس برتن کو سات مرتبہ دھوؤ اور پہلی مرتبہ مٹی سے دھوؤ۔ اب اس حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ کا اصل مقصود برتن کی صفائی ہے اور اگر برتن کی صفائی آج کل صابون یا سَرف وغیرہ سے اچھی طرح ہوتی ہے تو ہمیں مٹی کی جگہ وہی استعمال کرنا چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے کبھی بھی صابون سے غسل نہیں کیا یا سر کے بالوں کے لیے شیمپو استعمال نہیں کیا۔ صحیح روایات میں ہے کہ جب آپؐ کے زمانے میں کسی مردے کو غسل دیا جاتا تھا تو پانی میں بیری کے پتے اور کافور (خوشبو) ملا دی جاتی تھی اور اس سے مقصود طہارت اور جسم کی صفائی تھی۔ اب یہی مقصد صابون اور شیمپو وغیرہ سے اچھی طرح حاصل ہوتا ہے تو کیا ان کا استعمال خلافِ سنت اور خباثت ہوگا؟

ایجادات سے استفادہ کی حیثیت

ایک چیز جو اللہ کے رسول ﷺ کے دور میں نہیں تھی اس کو استعمال کرنا خلافِ سنت نہیں ہے۔ مثلاً

آپؐ کے دور میں کرسی، ٹیبل، چیچ، گاڑی، لاؤڈ اسپیکر، گھڑی، کمپیوٹر، پنکھا، اے سی، ریفریجریٹر، گیزر، عینک، ہیٹر، ٹیلی فون، موبائل، بجلی، گیس، جہاز، ریل، بحری جہاز، سکول، کالج، یونیورسٹی، جدید آلات حرب، ادویات، گولیاں، انجکشن، ہسپتال اور تمام میڈیکل سائنس وغیرہ کچھ بھی نہ تھا۔ کوئی بھی صاحب عقل ان اشیاء کے استعمال کو خلاف سنت یا خباثت نہیں کہہ سکتا، سوائے اس کے کہ جو جہالت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہو۔ یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ ان اشیائے جدیدہ کے وہ استعمالات جو کہ شریعتِ اسلامیہ کی صریح نصوص کے خلاف ہوں، یا وہ ایجادات مقاصد شریعہ کو فوت کرنے والی ہوں یعنی وہ انسان کے دین، جان، عقل، نسل، مال اور عزت کے فروغ اور حفاظت کے لیے نقصان دہ ہوں، ناجائز ہیں۔ اگر کرسی کا استعمال خلافِ سنت ہے تو پھر موبائل، بجلی، گیس، فون، گاڑی، جہاز، گھڑی وغیرہ سب کا استعمال بھی خلافِ سنت ہے۔ اگر اس طرح کے سطحی اصولوں کی روشنی میں سنت کے تصورات قائم کیے گئے تو ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ صحابہؓ میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں بچے گا جس نے سنت سے اختلاف نہ کیا ہو۔ اگر اس اصول کو درست مان لیا جائے تو تمام صحابہؓ (معاذ اللہ!) مخالفین سنت ہیں، کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں قرآن 'بَیْنَ الدُّفتین' موجود نہ تھا۔ حضرت ابوبکر h کے زمانے میں قرآن کو ایک جگہ جمع کیا گیا، تو صحابہؓ نے ایک ایسا کام کیا جو اللہ کے رسول ﷺ نے نہیں کیا تھا۔ حضرت عثمان h نے اپنے زمانے میں لوگوں کو ایک رسم الخط پر جمع کرنے کے لیے صحابہؓ سے ان کے مصاحف لے کر جلوا دیے تھے، یہ بھی ''خلافِ سنت'' کام تھا اور اکابر صحابہؓ نے اس کام میں حضرت عثمانؓ کی معاونت کی تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں قرآن کے نہ تو تیس پارے تھے، نہ ۵۴۵ رکوع تھے، نہ احزاب تھے، نہ اعراب وحرکات تھیں، حتیٰ کے نقطے اور رموزِ اوقاف بھی نہ تھے، اور یہ سب چیزیں تو خلفائے راشدین کے دور میں بھی نہ تھیں، بلکہ صحابہؓ کے زمانے کے بعد علماء نے ان کو قرآن پڑھنے میں سہولت وآسانی کے لیے لیے متعارف کروایا، یہ سب بھی ''خلافِ سنت'' ہے، لہٰذا آج کے دور میں طبع ہونے والے ہر قرآن کی تلاوت ''خلافِ سنت'' ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے دور میں نہ احادیث کی کتابیں تھیں، نہ سیرت وتاریخ کی، لہٰذا حدیث، سیرت اور تاریخ کی کتابوں کو لکھنا، ان کے ترجمے کرنا، ان ترجموں کو پڑھنا اور ان ترجموں سے علم حاصل کرنا سب خلاف سنت اور خباثت ہے، کیونکہ ان میں کوئی ایک فعل بھی اللہ کے رسول ﷺ یا صحابہؓ وتابعینؒ سے ثابت نہیں ہے۔ واللّٰہ المُستعان علی ما تَصِفُوْنَ۔

۞ اسی نقطۂ نظر کی یہ انتہا ہے کہ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ عورتوں کو کالج کی تعلیم دلوانا خلافِ سنت ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے دَور میں کالج نہیں تھے، جبکہ معاصر علماء اس بات کو امت مسلمہ کے لیے فرض کفایہ قرار دیتے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں اتنی خواتین لیڈی ڈاکٹرز موجود ہوں جو عورتوں کے ذاتی مسائل میں کفایت کرتی ہوں۔ اگر عورتوں کا میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنا خلاف سنت ہے تو ایک عورت کا ایک مرد ڈاکٹر کے سامنے جا کر اپنا ستر کھولنا کون سی سنت سے ثابت ہے؟ اس تصورِ سنت کے مطابق تو گولی

(tablet) کھانا' دوائی لینا' انجکشن لگوانا اور ڈاکٹر کے پاس جانا بھی خلافِ سنت ہونا چاہیے۔ فیا للعجب!

حق یہ ہے کہ یہ سب افعال مباحات کا دائرہ ہے جس میں انسان کو یہ اختیار ہے کہ وہ ان اشیاء کو استعمال کرے یا نہ کرے۔ اور بعض اوقات تو ان جدید آلات کو اسلام کی نشر و اشاعت اور دعوت و تبلیغ کے لیے استعمال کرنا فرضیت کے درجے کو پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح میڈیکل سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ کی تعلیم کو علماء نے فرض کفایہ قرار دیا ہے۔

جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمٰن اشرفی ایک دن دورانِ کلاس کہنے لگے کہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ ایک دفعہ چمچ سے کھانا کھا رہے تھے تو کسی نے کہا: حضرت ہاتھ سے کھانا سنت ہے۔ شاہ صاحبؒ نے جواب دیا: ہاتھ ہی سے تو کھا رہا ہوں۔

جن علماء کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دین کی گہرائی اور حکمت عطا فرمائی ہے انہیں کبھی اس مسئلے میں الجھن درپیش نہیں ہوتی کہ کیا چیز سنت ہے اور کیا خلاف سنت ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے دائیں ہاتھ سے کھانے پر زور دیا ہے اور چمچ سے کھاتے وقت یہ سنت پوری ہوتی ہے۔ صحیح روایات کے مطابق آپ ﷺ تین انگلیوں (یعنی انگوٹھا' شہادت والی انگلی اور درمیانی انگلی) سے کھانا کھاتے تھے' جیسا کہ صحیح مسلم' سنن ابو داؤد' سنن ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں ہے۔ یہ سنت اگرچہ ہاتھ سے بھی پوری ہوتی ہے لیکن بعض لوگوں کو اس میں مشکل ہوتی ہے۔ اب اگر یہ لوگ چمچ سے کھانا کھائیں تو یہ سنت بھی باآسانی پوری ہو جاتی ہے۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے کھانا کھانے کے بعد ہاتھ صاف کرنے سے پہلے ان کو چاٹ لینے یا چٹوا لینے کا حکم جاری کیا ہے تاکہ کھانے کی برکت ضائع نہ ہو اور یہ حکمت چمچ سے کھانے میں باحسن پوری ہوتی ہے۔ ہمارا مقصود یہ ہرگز نہیں ہے کہ لوگ ہاتھ سے کھانا چھوڑ دیں' بلکہ ہمارے نزدیک ہاتھ سے کھانا چمچ سے کھانے سے زیادہ افضل ہے' لیکن یہ بتانا مقصود ہے کہ چمچ سے کھانا بھی خلافِ سنت نہیں ہے اور کھانے کے تمام آداب چمچ سے کھانے میں بھی باحسن وخوبی پورے ہوتے ہیں۔

❁ اسی طرح بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ برگر وغیرہ کو کھانے کا طریقہ خلافِ سنت ہے' کیونکہ اس کو ہاتھ سے توڑے بغیر براہ راست منہ سے نوچ کر کھایا جاتا ہے۔ اصل سنت دائیں ہاتھ سے کھانا ہے جو کہ برگر کو کھانے میں بھی پوری ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کے پاس سیب ہے اور اس کو کاٹنے کے لیے کوئی چھری یا چاقو وغیرہ نہیں ہے تو اب یہ شخص سیب کو کیسے کھائے گا؟ کیا اس کے لیے اس حالت میں سیب کھانا ممنوع ہوگا تاکہ کفار کی مشابہت نہ ہو جائے؟ یا جائز ہوگا؟ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ انْتَهَسَ مِنْ کَتِفٍ ثُمَّ صَلّٰی وَلَمْ یَتَوَضَّأْ(۱۶۶)

''اللہ کے نبی ﷺ نے شانے والی بوٹی سے گوشت نوچ کر کھایا' پھر آپؐ نے نماز پڑھی اور وضو نہیں فرمایا۔''

شیخ احمد شاکر نے اس روایت کی سند کو 'صحیح' کہا ہے۔(۱۶۷)

۞ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں صرف دو وقت کا ہی کھانا ہے اور ناشتہ کرنا بدعت ہے۔ حالانکہ یہ صریح روایات کے خلاف بات ہے۔ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ناشتہ کرتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں' حضرت عائشہ k فرماتی ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَاْتِيْنِيْ فَيَقُوْلُ: اَعِنْدَكِ غَدَاءٌ؟ فَاَقُوْلُ: لَا' فَيَقُوْلُ: اِنِّيْ صَائِمٌ ' قَالَتْ فَاَتَانِيْ يَوْمًا فَقُلْتُ : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهُ قَدْ اُهْدِيَتْ لَنَا هَدِيَّةٌ' قَالَ : وَمَا هِيَ؟ قُلْتُ: حَيْسٌ ' قَالَ: اَمَا اِنِّيْ قَدْ اَصْبَحْتُ صَائِمًا' قَالَتْ: ثُمَّ اَكَلَ(۱۶۸)

''اللہ کے نبی ﷺ میرے پاس آتے تھے اور سوال کرتے تھے کہ کیا تمہارے پاس ناشتہ کرنے کو کچھ ہے؟ تو میں کہتی کہ نہیں ہے۔ تو آپؐ فرماتے: میں نے روزہ کی نیت کر لی ہے۔ حضرت عائشہ k کہتی ہیں کہ ایک دن آپؐ میرے پاس آئے تو میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ آج ہمیں کچھ ہدیہ ملا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ تو میں نے کہا وہ حلوہ ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا: میں نے صبح روزے کی نیت کی تھی۔ حضرت عائشہ k فرماتی ہیں کہ آپؐ نے پھر وہ حلوہ کھالیا''۔

امام ترمذیؒ نے اس روایت کو 'حسن' کہا ہے۔ علامہ البانیؒ نے بھی روایت کو 'حسن صحیح' کہا ہے۔(۱۶۹)

۞ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ موٹر سائیکل پر بیٹھنا خلاف سنت بلکہ دجالی تہذیب کا مظہر ہے' کیونکہ اگر عام حالات میں دو اشخاص اس طرح بیٹھے ہوں جس طرح موٹر سائیکل پر دو افراد بیٹھتے ہیں تو یہ فعل بے حیائی معلوم ہوتا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر صحابہؓ کے زمانے میں اونٹ یا گھوڑے پر دو افراد بیٹھتے تھے تو اس کا کیا طریقہ تھا؟ کیا ایک دوسرے کے کندھے پر بیٹھتے تھے؟ صحیح روایات میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے بعض صحابہؓ کو اپنے پیچھے بٹھا کر اونٹ پر سواری کی' مثلاً صحیحین کی ایک روایت کے مطابق حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات سے منیٰ واپسی کی طرف راستے میں حضرت فضل بن عباس i آپؐ کے ساتھ آپؐ کے پیچھے ایک ہی اونٹ پر سوار تھے۔(۱۷۰)

۞ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ زمین پر بیٹھنا ہی سنت ہے اور کرسی پر بیٹھنا خلاف سنت اور خباثت ہے' کیونکہ آپؐ کبھی کرسی پر نہیں بیٹھے۔ ہمارے علم کی حد تک اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں یہ مروی نہیں ہے کہ آپؐ کرسی پر بیٹھے ہیں یا نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ سے ایک فعل کے مروی نہ ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ آپؐ نے وہ فعل کیا ہی نہیں ہے' کیونکہ عدم ذکر' عدم فعل کو مستلزم نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ کہاں سے ثابت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے کرسی پیش کی گئی ہو اور آپؐ نے اس پر بیٹھنے سے انکار کیا ہو۔ تیسری بات یہ ہے کہ بعض صحابہؓ کے بارے میں ملتا ہے کہ وہ کرسی پر بیٹھے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں' حضرت ابووائل الاسدیؒ فرماتے ہیں:

جَلَسْتُ مَعَ شَيْبَةَ عَلَى الْكُرْسِيِّ فِي الْكَعْبَةِ فَقَالَ: لَقَدْ جَلَسَ هٰذَا الْمَجْلِسَ عُمَرُ(۱۷۱)

''میں حضرت شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ العبدریؓ کے ساتھ خانہ کعبہ میں موجود ایک کرسی پر بیٹھا تو انہوں نے کہا: اس جگہ حضرت عمر h بھی بیٹھے تھے''۔

اگر چہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے زمانے میں ایسی کرسیاں نہیں تھیں جیسی آج کل ہیں' لیکن کرسی کا تصور تاریخ انسانی میں بہت پرانا چلا آ رہا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی کرسی کا ذکر ہے اور حضرت سلیمان d کی کرسی کا بھی تذکرہ ہے۔ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق اوائل نبوت میں آپ ﷺ نے جب حضرت جبرئیل d کو دیکھا تھا تو وہ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ 'لسان العرب' میں کرسی کی تعریف میں لکھا ہے: **الذی نعرفه من الکرسی فی للغة الشیء الذی یعتمد علیه ویجلس علیه** یعنی کرسی کا لغت عرب میں جو معنی معروف ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس پر ٹیک لگائی جائے اور جس پر بیٹھا جائے۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کا منبر پر بیٹھنا صحیح روایات سے ثابت ہے' آپؐ کے زمانے میں اصحابِ صفہ کے لیے ایک چبوترہ تھا جس پر وہ بیٹھا کرتے تھے۔ صحیح روایات کے مطابق حضرت عائشہؓ کے پاس ایک چارپائی تھی جس پر وہ سویا کرتی تھیں اور امام بخاری تو اپنی صحیح میں 'کتاب الاستئذان' کے تحت 'باب السریر' لے کر آئے ہیں۔ ایک صحیح روایت کے مطابق آپ ﷺ کے پاس بھی کھجور کی شاخوں اور پتوں سے بنی ہوئی ایک چارپائی تھی جس پر بستر بھی بچھایا ہوا تھا۔(۱۷۲)

ان سب روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہؓ ہر حال میں زمین پر نہیں بیٹھے تھے' بعض اوقات آپؐ نے زمین سے بلند چیزوں مثلاً چبوترہ' منبر اور چارپائی وغیرہ کو بھی بیٹھنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ بعض اوقات ایک شخص اپنی جہالت اور کم علمی کی وجہ سے ایک فعل کو خلافِ سنت یا خباثت کہہ رہا ہوتا ہے حالانکہ وہ فعل سنت سے ثابت ہوتا ہے۔

ایک ذاتی واقعہ

ایک دفعہ ایک جگہ راقم الحروف کو درس دینے کا اتفاق ہوا تو ایک صاحب کہنے لگے کہ ماشاء اللہ! آپ کا درس بہت عمدہ تھا لیکن اگر آپ کے کپڑے بھی سفید ہوتے تو سنت کی اتباع بھی ہو جاتی اور لوگ بھی آپ کی باتوں سے زیادہ متأثر ہوتے۔

یہ بات تو درست ہے کہ اگر واقعتاً کسی جگہ سفید لباس یا عمامہ یا ٹوپی پہن کر جانے سے کسی مدرس کے سامعین اس کی باتوں کا اثر لیں گے تو اس چیز کا لحاظ رکھنا دین کی حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے۔ لیکن ہم پھر یہی کہیں گے کہ اگر مقصود سامعین پر اپنی شخصیت کا اثر ڈالنا ہے تا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات کو توجہ سے سنیں تو آپ کے بعض سامعین ایسے بھی ہوں گے کہ عمامہ یا سفید لباس پہننے کی بجائے آپ

تھری پیس سوٹ میں ان سے خطاب کریں گے تو آپ کی بات زیادہ توجہ سے سنیں گے اور ایک عام مولوی سمجھتے ہوئے آپ کو اجنبی نگاہ سے نہ دیکھیں گے۔ جہاں تک دین کا معاملہ ہے تو یہ بات ثابت ہے کہ سفید لباس کو اللہ کے رسول ﷺ نے پسند کیا ہے اور اس کے پہننے کی ترغیب دی ہے' لیکن صحابہ کرام j سفید کے علاوہ رنگوں کے لباس بھی پہنتے تھے بلکہ صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ کو سب سے زیادہ ''حبرۃ'' لباس پسند تھا۔ بعض شارحین بخاری نے اس کا ترجمہ دھاری دار یمنی لباس جبکہ بعض علماء نے یمنی سبز چادر کیا ہے۔ (۱۷۳) ہوا یہ کہ سفید لباس والی روایت تو نقل ہوئی اور لوگوں میں عام بھی ہوگئی لیکن دھاری دار یا سبز کپڑوں والی روایت عام نہ ہوئی' جس سے لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ شاید صرف سفید لباس پہننا ہی اللہ کے رسول ﷺ کو پسند تھا۔

ضعیف وموضوع روایات کا درجہ

ضعیف اور موضوع روایت سے اللہ کے رسول ﷺ کی کوئی سنت ثابت نہیں ہوتی۔ البتہ ایک ضعیف روایت اگر 'حسن لغیرہ' کے درجے کو پہنچ جائے تو اس سے اللہ کے رسول ﷺ کی سنت ثابت ہوتی ہے۔

۞ ایک صاحب ایک دفعہ دوران گفتگو فرمانے لگے کہ فجر کی نماز کے بعد سونا ممنوع ہے' آپؐ نے اس سے منع فرمایا ہے اور اس کی دلیل یہ روایت ہے:

((اِذَا صَلَّیْتُمُ الْفَجْرَ فَلَا تَنَامُوْا عَنْ طَلَبِ اَرْزَاقِکُمْ)) (۱۷۴)

''جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنے رزق کو تلاش کرنے کی بجائے سو نہ جاؤ۔''

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ روایت 'ضعیف' ہے۔ علامہ البانیؒ نے اس روایت کو 'ضعیف' کہا ہے (۱۷۵)۔ بعض اصحاب کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ ضعیف ہے تو کیا ہے' روایت تو ہے نا؟ ضعیف کی محدثین نے سترہ کے قریب اقسام بیان کی ہیں اور ان میں سے ایک موضوع بھی ہے۔ علماء نے اس مسئلے میں مستقل کتابیں اور مقالے لکھے ہیں کہ ضعیف حدیث دینی مسائل میں حجت نہیں ہے۔ ہم یہاں پر اس کے دلائل سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اتنی بات کہیں گے کہ اگر یہ حضرات ضعیف حدیث کی کتابوں میں موجود ضعیف روایات کو دیکھ لیں تو ان کو احساس ہوگا کہ مطلقاً ضعیف روایات کو قبول کرنے کا اصول بنانے سے یہودیت' عیسائیت' ہندو مت اور اسلام کا ایک ملغوبہ تو وحدتِ ادیان کی شکل میں تیار ہوسکتا ہے لیکن اللہ کا وہ خالص دین جو کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا گیا' اپنی اصل حالت میں برقرار نہیں رہے گا۔ جب یہ حضرات ضعیف احادیث کو قبول کرنے کا اصول بناتے ہیں تو پھر انہیں وہ تمام ضعیف روایات بھی قبول کرنی پڑیں گی جو شرک و بدعات اور توہمات وخرافات کی تعلیمات پر مبنی ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث کو قبول کر لیا جائے' تو پھر بھی ہم یہی کہیں گے کہ کاش! یہ حضرات ضعیف حدیث پر مبنی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیتے تو انہیں احساس ہوتا کہ ضعیف حدیث کے

نام پر کیسی کیسی بدعات اللہ کے رسول ﷺ کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ ائمہ سلف نے بہت سی ایسی کتابیں لکھی ہیں جن میں صرف ضعیف یا موضوع روایات کو جمع کیا گیا ہے اور ہمارے نزدیک ان کتب کی تالیف میں ضعیف و موضوع روایات سے باخبر کرنے کے علاوہ مؤلفین کے پیش نظر ایک اور مقصد یہ بھی تھا کہ ضعیف و موضوع روایات سے ثابت ہونے والی خرافات کی ایک تصویر پیش کی جا سکے تاکہ صحیح احادیث سے ثابت شدہ دین اسلام اور اس دینِ خرافات کے زمین و آسمان جیسے فرق کو واضح کیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر متذکرہ بالا ضعیف روایت کو بطور دلیل قبول بھی کر لیا جائے تو پھر بھی اس میں فجر کے بعد سونے کی نہی نہ تو حرمت کے لیے ہے' اور نہ ہی کراہت کے لیے ہے بلکہ یہ ''ارشاد'' ہے' یعنی آپ ﷺ اپنی اُمت سے حد درجہ محبت کی وجہ سے بعض اوقات ان کے دنیاوی معاملات میں بھی ان کو کوئی بات بطور مشورہ بیان کر دیتے تھے جس کا دین سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا یہ حدیث بیانِ ارشاد ہے نہ کہ بیانِ شرع۔

اس ساری بحث سے ہمارا مقصود قطعاً یہ نہیں ہے ہم فجر کے بعد سونے کو پسند کرتے ہیں یا اس کے حامی ہیں' ہمارے نزدیک فجر کے بعد سونا ایک ناپسندیدہ فعل ہے' اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے رات سونے کے لیے بنائی ہے نہ کہ دن' لیکن اگر کوئی شخص فجر کے بعد سونے کو سنت رسول ﷺ کی خلاف ورزی قرار دے گا تو ہمارے نزدیک یہ شخص ایک ایسی چیز کو سنت یا دین قرار دے رہا ہے جو سنت یا دین نہیں ہے' اور ایسے شخص کا رد کرنا اور دین اسلام کو اس قسم کی آلائشوں سے پاک کرنا علماء کا بنیادی فریضہ ہے' تاکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف کسی ایسی چیز کی نسبت نہ ہو جو انہوں نے نہ کہی تھی اور نہ اس کو چاہا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی تقاریر

تقریر سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے کوئی کام ہوا ہو اور آپؐ نے اس پر خاموشی اختیار کی ہو۔ آپ ﷺ کا کسی کام کو دیکھ کر خاموشی اختیار کرنا اس کے جواز کی علامت ہے۔ محمد بن المنکدرؒ فرماتے ہیں:

رَاَیْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللّٰه عنه یَحْلِفُ بِاللّٰهِ اَنَّ ابْنَ الصَّائِدِ الدَّجَّالُ' قُلْتُ : تَحْلِفُ بِاللّٰهِ؟ قَالَ اِنِّیْ سَمِعْتُ عُمَرَ یَحْلِفُ عَلٰی ذٰلِکَ عِنْدَ النَّبِیِّ ﷺ فَلَمْ یُنْکِرْهُ النَّبِیُّ ﷺ(۱۷۶)

''میں نے حضرت جابر بن عبداللہ i کو دیکھا کہ وہ اللہ کی قسم کھا کر کہہ رہے تھے کہ ابن صیاد ہی دجال ہے۔ میں نے کہا کیا آپ اللہ کی قسم کھا کر یہ بات کہہ رہے ہیں؟ تو حضرت جابرؓ نے کہا: میں نے حضرت عمر h کو اس بات پر اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے قسم کھاتے ہوئے دیکھا اور آپؐ

نے حضرت عمر h کا انکار نہیں کیا''۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ آپؐ کی تقریر کو حجت سمجھتے تھے۔ بعض اوقات صحابہؓ کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ہم آپؐ کے زمانے میں یہ کام کرتے تھے اور آپؐ کو اس علم بھی ہوتا' اگرچہ یہ کام آپؐ کے سامنے نہیں ہوا ہوتا' یہ بھی آپ ﷺ کی تقریر میں شامل ہے۔ مثلاً:

كُنَّا نَعْزِلُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَبَلَغَ ذٰلِكَ نَبِيَّ اللّٰهِ ﷺ فَلَمْ يَنْهَنَا (۱۷)

''ہم اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں عزل کیا کرتے تھے اور آپؐ کو یہ بات معلوم بھی ہوگئی تھی لیکن آپ نے ہمیں منع نہیں فرمایا تھا''۔

کسی صحابیؓ یا صحابہؓ کا عمل جو انہوں نے آپ ﷺ کے زمانے میں کیا ہو' لیکن آپؐ کے سامنے نہ کیا ہو اور نہ ہی آپ کو اس کی خبر دی گئی ہو' تو کیا وہ بھی آپؐ کی تقریر میں شامل ہے؟ اس قسم کے اور مسائل میں بھی تفصیل ہے جو کہ اصولِ فقہ کی کتابوں میں درج ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت و اتباع کے حوالے سے سب سے بہترین معیار آپ کے صحابہ j ہیں۔ خلفائے راشدین' عشرۂ مبشرہ' اصحابِ بدر' مہاجرین و انصار میں سے اکثر صحابہؓ اللہ کے رسول ﷺ کے جن جن اقوال و افعال اور تقریر و تصویب کی پیروی اہتمام سے کرتے تھے اس کے دین ہونے میں کوئی شک نہیں ہے' لیکن آپ ﷺ کے جن اقوال و افعال یا تقریر و تصویب کی اتباع جمہور و جلیل القدر صحابہؓ نے نہ کی تو یہ اس بات کا بہت بڑا قرینہ ہے کہ وہ تمام افعال و اقوال یا تقریر و تصویب اُمت کے حق میں دین نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے کسی قول و فعل یا تقریر و تصویب پر جمہور و جلیل القدر صحابہؓ کا عمل تھا یا نہیں' اس کے لیے کتب احادیث' سیرت النبی' سیرتِ صحابہؓ اور تاریخ کی کتب سے رہنمائی لی جاسکتی ہے۔

خلاصۂ بحث

خلاصۂ کلام یہی ہے کہ ایک عامی شخص کا محض قرآن و سنت کے ترجموں سے کسی نئی فکر کا استوار کرنا یا کوئی نیا نظریہ قائم کرنا عصر حاضر کا ایک بہت بڑا فتنہ ہے جس میں کثیر لوگ مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُمت مسلمہ کو ایسے فتنوں سے بچائے جو اُمت کو انتشارِ ذہنی کی طرف لے کر جانے والے ہوں اور لوگوں کے دلوں میں علمائے سلف اور علم دین کی قدر اور عظمت کا احساس پیدا کرے۔ آمین!

حواشی

(۱۰۳) الوجیز' ص ۱٦٥۔

(۱۰٤) علوم الحدیث فی ضوء تطبیقات المحدثین النقاد' ص ۱٥'۱٦۔

(۱۰٥) الوجیز' ص ۱٦٥۔

(۱۰٦) الاحکام فی اصول الاحکام' جلد ۱' ص ۲۲۷' ۲۲۸۔

(١٠٧) الوجيز، ص٧٤۔ (١٠٨) مجموع الفتاوىٰ، ج١، ص٢٨٠۔
(١٠٩) مجموع الفتاوى:جلد١، ص٢٨٠۔ (١١٠) سنن البيهقى الكبرىٰ، جلد٥، ص١٥٣۔
(١١١) صحيح ابى داوٗد:١٨٧٨۔ وصحيح ابن ماجه:٢٤٠٢۔
(١١٢) الالمام، ج١، ص ١٩٠۔ (١١٣) عارضة الاحوذىٰ، ج٢، ص ٢٩٤۔
(١١٤) علامه احمد العدوى، اصول فى البدع والسنن:ص٥٦۔
(١١٥) صحيح البخارى، كتاب الأطعمة، باب الشواء۔
(١١٦) صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب نهى من أكل ثوما أو بصلا أو كراثا أو نحوها.....۔
(١١٧) صحيح البخارى، كتاب اللباس، باب البرانس۔
(١١٨) صحيح البخارى، كتاب الصلاة، باب عقد الإزار على القفا فى الصلاة۔
(١١٩) صحيح البخارى، كتاب الصلاة، باب إذا صلى فى الثوب الواحد فليجعل على عاتقيه۔
(١٢٠) صحيح البخارى، كتاب الصلاة، باب الصلاة فى القميص والسراويل والتبان والقباء۔
(١٢١) فتاوىٰ اللجنة الدائمة: ج١٤،ص ٤٣۔ (١٢٢) فتاوىٰ اللجنة الدائمة: ج١٤، ص٤٤۔
(١٢٣) صحيح البخارى، كتاب الصوم، باب الوصال.....
(١٢٤) صحيح البخارى، كتاب مواقيت الصلاة، باب ما يصلى بعد العصر من القوائت ونحوها۔
(١٢٥) صحيح البخارى، كتاب الحج، باب الطواف بعد الصبح والعصر۔
(١٢٦) صحيح البخارى، كتاب الجمعة، باب اذا كلم وهو يصلى فاشار بيده واستمع۔
(١٢٧) صحيح البخارى، كتاب مواقيت الصلاة، باب لا تتحرى الصلاة قبل غروب الشمس۔
(١٢٨) الاحكام، جلد١، ص٢٢٨۔
(١٢٩) صحيح البخارى، كتاب الاذان، باب الاذان للمسافر.....
(١٣٠) صحيح الجامع الصغير: ٧٨٨٢۔ وسنن النسائى، كتاب مناسك الحج، باب الركوب الى الجمار.....
(١٣١) صحيح بخارى، كتاب الصلاة، باب إذا حمل جارية صغيرة على عنقه فى الصلاة۔
(١٣٢) صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب جواز حمل الصبيان فى الصلاة۔
(١٣٣) سنن البيهقى الكبرىٰ، جلد٥، ص١٥٣۔
(١٣٤) صحيح مسلم، كتاب الحج، باب استحباب النزول بالمحصب يوم النفر والصلاة به۔
(١٣٥) صحيح مسلم، كتاب الحج، باب استحباب النزول بالمحصب يوم النفر والصلاة به۔
(١٣٦) صحيح البخارى، كتاب اللباس، باب ينزع نعله اليسرىٰ، ح ٥٤٠٧۔
(١٣٧) الإحكام، جلد١، ص٢٢٨۔ (١٣٨) الإحكام، جلد١، ص٢٢٨،٢٢٩۔
(١٣٩) صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب صحة صوم من طلع عليه الفجر وهو جنب۔
(١٤٠) الاحكام، جلد١، ص٢٢٩۔ (١٤١) الوجيز:ص١٦٥۔
(١٤٢) اصول فى البدع والسنن:ص٥٦۔ (١٤٣) احكام القرآن، جلد١، ص٣٩١۔
(١٤٤) صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب جواز الانصراف من الصلاة عن اليمين والشمال۔
(١٤٥) صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب جواز الانصراف من الصلاة عن اليمين والشمال۔

(١٤٦) سنن النسائی، کتاب السهو، باب الانصراف من الصلاة۔
(١٤٧) صحیح البخاری، کتاب الاشربة، باب الشرف قائمًا۔
(١٤٨) موطأ مالك، کتاب الجامع، باب ما جاء في شرب الرجل۔
(١٤٩) سنن الترمذی، کتاب الاشربة عن رسول اللّٰہ ﷺ، باب ما جاء فی الرخصة فی الشرف قائمًا۔
(١٥٠) صحیح الترمذی:١٨٨٠۔ (١٥١) هداية الرواة، ج٤، ص ١٨٠۔
(١٥٢) سنن الترمذی، کتاب الاشربة عن رسول اللّٰہ ﷺ، باب ما جاء فی الرخصة فی الشرف قائمًا۔
(١٥٣) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب من اتی مسجد قباء کل سبت۔
(١٥٤) صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب الترغیب فی قیام رمضان وهو التراویح۔
(١٥٥) صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب الترغیب فی قیام رمضان وهو التراویح۔
(١٥٦) صحیح البخاری، کتاب صلاة التراویح، باب فضل من قام رمضان۔
(١٥٧) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب وجوب صلاة الجماعة۔
(١٥٨) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب الرمل فی الطواف والعمرة۔
(١٥٩) شرح النووی علی صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب الرمل فی الطواف والعمرة۔
(١٦٠) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب سواك الرطب والیابس للصائم۔
(١٦١) ارواء الغلیل، جلد١، ص١٠٤۔ (١٦٢) طرح التثریب:جلد٢، ص٦٨۔
(١٦٣) الدرایة، جلد١، ص ١٨۔ (١٦٤) فتاویٰ، جلد٨، ص٢٣٧١۔
(١٦٥) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب السواك یوم الجمعة۔ وسنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول اللّٰہ ﷺ، باب ما جاء فی السواك۔
(١٦٦) مسند احمد:٢٣٩٣۔ (١٦٧) مسند احمد، ج٥، ص ١٣٥۔
(١٦٨) سنن الترمذی، کتاب الصوم عن رسول اللّٰہ ﷺ، باب صیام المتطوع بغیر تبییت۔
(١٦٩) صحیح الترمذی: ٧٣٤۔
(١٧٠) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب حجة الوداع۔
(١٧١) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب کسوة الکعبة۔
(١٧٢) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة اوطاس۔
(١٧٣) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب البرود والحبر الشملة۔
(١٧٤) فیض القدیر، جلد١، ص٣٩٤، المکتبة التجاریة الکبری، مصر-
(١٧٥) ضعیف الجامع:٥٧٣۔
(١٧٦) صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب و السنة، باب من رأی ترك النکیر من النبی ﷺ حجة لا من غیر الرسول۔
(١٧٧) صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب حکم العزل۔

فکر ونظر

جماعت سازی اور اس کی بنیادیں (۴)

قاری یحییٰ اشرف عبدالغفار☆

مشاورت کے باب میں رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ

آیئے اب مشاورت کے باب میں اُسوۂ رسولؐ اور خلفاء راشدینؓ کا تعامل پیش کیا جاتا ہے' جس کا اتباع بموجب حدیث نبویؐ ((عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ)) ہمارے لیے ضروری ہے۔

واقعہ ا: صلح حدیبیہ: آیت کریمہ ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ﴾ کی شرح میں پہلے تفصیلاً واضح کیا جا چکا ہے کہ کسی بھی معاملے میں مشیروں کا کام صرف مشورہ دینا ہے۔ اب امام کو اختیار ہے کہ ان میں سے کسی کی رائے پر عزم کر کے نفاذ کرے یا اپنی رائے پر عزم کر کے نفاذ کرے۔ اس کی سب سے بڑی نظیر صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے' جس کی تفصیلات میں یہ موجود ہے کہ شرائط صلح نامہ اور احرام کھولنے میں جمہور صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی رائے سے اختلاف کیا' لیکن آپ ﷺ نے صلح کو مناسب سمجھ کر اُن میں سے کسی کی رائے کو اختیار نہیں کیا' بلکہ اپنی رائے پر عزم کر کے اس کو نافذ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا اختیار امیر ہی کو ہوتا ہے۔ جیسا کہ ملکہ بلقیس نے جب اہل دربار سے حضرت سلیمان d کا خط پا کر مشورہ طلب کیا تھا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِیْ فِیْۤ اَمْرِیْ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴾ (النمل) ''اے درباریو! میرے اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو' کیونکہ میں کسی معاملہ میں قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک تم نہ حاضر ہو۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قطع امر یعنی نفاذ تو امیر ہی کا حق ہے' البتہ مشورہ اہل دربار سے لے لیا جاتا ہے۔ اہل دربار نے جواب دیا: ﴿نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَیْكِ فَانْظُرِیْ مَاذَا تَاْمُرِیْنَ ﴾ ''ہم اہل قوت ہیں اور سخت لڑنے والے ہیں' لیکن معاملہ کا اختیار تمہیں ہے' پس تم غور کر لو کیا حکم دینا ہے۔'' اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ اصل اختیار امیر کو ہے۔ چنانچہ اس کے تحت تفسیر کبیر میں مرقوم ہے: **وذلک اظهار الطاعة لها** اور اس میں بلقیس کے لیے اطاعت کا اظہار ہے''۔(۱۰۶)

☆ ریسرچ ایسوسی ایٹ' شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

الغرض صلح حدیبیہ کے واقعہ سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ امیر اہل شوریٰ کا پابند نہیں ہے' بلکہ نفاذ میں مختار ہے۔

واقعہ۲: رسول اللہ ﷺ نے اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ k کی رائے پر حرف بحرف عمل فرمایا۔ پس امیر کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے مقابلہ میں اقلیت کا مشورہ قبول کرسکتا ہے۔ نیز یہ کہ عورتوں کا مشورہ بھی قبول کیا جاسکتا ہے۔ اس میں دلیل ہے کہ ہر عورت ایسی نہیں ہوتی کہ اس کی رائے کو اہمیت نہ دی جائے۔

واقعہ۳: ایک اور واقعہ حضرت بریرہ k کا ہے۔ یہ باندی تھیں اور حضرت مغیث h کے نکاح میں تھیں' جو غلام تھے۔ حضرت بریرہ k کے آقا نے انہیں آزاد کردیا۔ آزاد ہوجانے کے بعد زوجہ کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت بریرہ k نے مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے نکاح فسخ کردیا اور حضرت مغیثؓ سے علیحدگی اختیار کرلی۔ حضرت مغیثؓ کو چونکہ ان سے محبت تھی اس لیے حضرت بریرہؓ کی علیحدگی سے بہت پریشان ہوئے۔ گلی کوچہ میں ان کی جدائی کے سبب روتے پھرتے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کو حضرت مغیثؓ پر رحم آیا اور حضرت بریرہؓ کو مشورہ دیا کہ حضرت مغیثؓ سے دوبارہ نکاح کر لیں۔ حضرت بریرہ نے عرض کیا: اَتَاْمُرُنِیْ ''کیا آپ حکم فرما رہے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَنَا الشَّفِیْعُ)) ''میں سفارش کرتا ہوں''۔ یعنی حکم نہیں مشورہ ہے۔ حضرت بریرہؓ نے عرض کیا: لَا حَاجَةَ لِیْ فِیْهِ (مجھے اس کی ضرورت نہیں)[۱۰۷] اس پر آنحضور ﷺ نے نہ تو انہیں مجبور کیا نہ ناگواری کا اظہار کیا۔ اس واقعہ سے جہاں مشورہ کی حقیقت اور عدم جبر کی اہمیت معلوم ہوئی وہیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر کسی کا مشورہ قبول نہ کیا جائے تو اس کو مشیر سے منقبض نہیں ہونا چاہیے۔ غرضیکہ مشورے کا معاملہ حتمی فیصلے سے جدا ہے۔ اس حتمی فیصلہ کو فَاِذَا عَزَمْتَ میں عزم سے تعبیر فرمایا گیا ہے کہ آپ ﷺ کے عزم کر لینے کے بعد پھر کسی کو مخالفت کی گنجائش نہیں رہتی' پھر تو بس سمع وطاعت ہی ہے۔

واقعہ۴: غزوۂ احزاب میں تمام عرب قبائل اور یہودیوں کی اتحادی طاقت نے مل کر مدینہ منورہ پر حملہ کردیا تھا۔ کفار کی تعداد تقریباً ۱۲ ہزار تھی۔ نبی اکرم ﷺ کو جب اس کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام j سے مشورہ کیا۔ اس مجلس میں حضرت سلمان فارسی h بھی موجود تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ دشمن کا حملہ روکنے کے لیے خندق کھود کر ان کا راستہ روک دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا مشورہ قبول فرمایا اور خندق کھودنے کا حکم دیا اور خود بھی بنفس نفیس اس کام میں شریک ہوگئے۔ اس غزوہ میں جب محاصرہ طویل ہوگیا اور مخالفین کی کثرت سے مسلمان مضطرب ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ نے عیینہ بن حصن اور حارث بن عوف کو بلوایا۔ یہ دونوں قبیلہ غطفان کے سردار تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے مدینہ کی ثلث پیداوار پر مصالحت کی بات شروع کی۔ حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ i کو معلوم ہوا تو مصالحت

نہ کرنے کا مشورہ دیا۔اس کو آپ ﷺ نے قبول فرمالیا۔ چنانچہ آیہ کریمہ ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ کے تحت احکام القرآن میں ہے:

اشار علیه السعدان (ای سعد بن معاذ وسعد بن عبادة) یوم الخندق بترک مصالحة غطفان علی بعض اثمار المدینة فقبل منهم(۱۰۸)

''حضراتِ سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ i نے غطفان سے مدینہ کی کچھ پیداوار پر مصالحت نہ کرنے کا مشورہ دیا تو اسے آپ ﷺ نے قبول فرمالیا۔''

ان دونوں واقعات سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ایک یہ کہ اقلیت کے مشورے کو بھی قبول کیا جاسکتا ہے۔دوسری بات یہ کہ ممبرانِ شوریٰ کا متعین ہونا ضروری نہیں۔ **کیف ما اتفق** یعنی امیر جس سے چاہے مشورہ کرے یا جو چاہے مشورہ دے دے۔امیر کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے۔

واقعہ۵: رسول اللہ ﷺ نے جب قافلۂ ابوسفیان کے تعاقب کے بارے میں صحابہ کرام j سے مشورہ کیا کہ قافلۂ مذکورہ کا تعاقب کیا جائے یا یہیں سے واپسی کی جائے تو حضراتِ ابوبکر وعمر i کے مشورہ سے آپ ﷺ نے اعراض کیا۔اور جب سعد بن عبادہ h نے مشورہ دیا تو آپ ﷺ نے قبول فرما لیا اور قافلے کا تعاقب کیا۔(۱۰۹)

اس واقعہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مشورہ کے لیے تعیین اشخاص ضروری نہیں' بلکہ متعلقین معاملہ سے مشورہ لیا جاتا ہے۔جیسا کہ یہاں آپ ﷺ نے انصار کی رائے معلوم کی' کیونکہ ان سے ہی معاملہ کا تعین تھا'اور حضراتِ ابو بکر و عمر i جیسے افضل الأمت کے مشورے سے بھی اعراض کیا۔نیز اس سے صحابہ کرام j کا جذبۂ اطاعت وفرمانبرداری بھی خوب جھلک رہا ہے کہ اعراض پر انہیں ذرہ برابر گرانی نہیں ہوئی۔

حضرت ابوبکر h کا طریق کار

حضرت ابوبکر صدیق h خلیفہ مقرر ہوئے تو سب سے پہلا کام جو آپؓ نے کیا وہ جیش اسامہؓ کی روانگی تھا۔چنانچہ آپؓ نے حکم دے دیا کہ لشکر اسامہ تیار ہو کر روانہ ہو جائے۔اُس وقت بہت سے عرب مرتد ہو گئے تھے۔نفاق کی تاریکی الگ چھائی ہوئی تھی۔ان حالات کے تحت حضراتِ صحابہؓ پر لشکر اسامہ کو روانہ کرنا شاق گزر رہا تھا۔چنانچہ روایات میں ہے: **فشق ذلک علی کبار المهاجرین الاولینْ** یہ (جیش اسامہ کی روانگی) مہاجرین اوّلین پر بہت گراں گزری''۔(۱۱۰)

اسی واقعہ میں ہے کہ انصار نے حضرت عمر h کی زبانی حضرت ابوبکرؓ تک یہ بات پہنچائی کہ اگر روانگی لشکر ضروری ہے تو بجائے حضرت اسامہؓ کے کسی زیادہ تجربہ کار اور سن رسیدہ شخص کو ہمارا سردار مقرر کیجیے۔جب حضرت عمرؓ نے انصار کا پیغام سنایا تو حضرت ابوبکرؓ غصے میں بیتاب ہو کر کھڑے ہو گئے اور تیزی

کے ساتھ فرمایا:

ثکلتک امک یا ابن الخطاب استعملہ رسول اللہ ﷺ تامرنی ان اعزلہ(۱۱۱)

''اے خطاب کے بیٹے! تم کو تمہاری ماں گم کرے' ان کو رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا اور تم مجھے حکم دیتے ہو کہ میں اِن کو معزول کر دوں؟''

اس واقعہ میں متعدد مشوروں کے باوجود امیر نے تنہا اپنے عزم پر عمل کیا' کسی کا مشورہ قبول نہیں کیا۔ اس عزم و توکل اور اطاعت رسول اللہ ﷺ کی برکت کا ایسا ظہور ہوا کہ جس قبیلے کی طرف سے یہ لشکر گزرتا تھا اس پر رعب طاری ہو جاتا تھا اور وہ اسلام کی طرف یہ کہتا ہوا آ جاتا تھا کہ اگر ان کے پاس قوت نہ ہوتی تو اتنی بڑی جمعیت ان کے پاس سے نہ نکلتی۔

واقعہ٦ : رسول اللہ ﷺ کی وفات شریفہ کے بعد مدینہ کے قرب و جوار کے قبائل نے مرتد ہو کر بالاتفاق مدینہ کا رُخ کیا اور مدینہ کو گھیر کر اپنے قاصد کو حضرت ابوبکر h کی خدمت میں بھیجا کہ نماز تو ہم سے پڑھوا لیجیے مگر زکوٰۃ معاف کر دیجیے۔ ان کا پیغام سن کر آپؓ نے صحابہ کرام j سے مشورہ کیا' سب نے صلاح دی کہ نرمی کا وقت ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: **یَا خَلِیْفَۃَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ تَاَلَّفِ النَّاسَ وَارْفَقْ بِھِمْ** ''اے خلیفۂ رسول اللہ! لوگوں کے ساتھ نرمی اور الفت کا برتاؤ کیجیے''۔ حضرت ابوبکر الصدیق h نے یہ مشورہ سن کر حضرت عمر h سے فرمایا: **اَجَبَّارٌ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ وَخوارٌ فِی الْاِسْلَامِ؟ قَدِ انْقَطَعَ الْوَحْیُ وَتَمَّ الدِّیْنُ اَیُنْقَصُ وَاَنَا حَیٌّ؟ وَاللّٰہِ لَاُجَاھِدَنَّھُمْ وَلَوْ مَنَعُوْنِیْ عِقَالاً**(۱۱۲) ''تم جاہلیت میں تو بہادر تھے اور اسلام میں آ کر کمزور ہو گئے؟ وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا اور دین کمال کو پہنچ گیا۔ میری زندگی ہی میں دین ناقص کر دیا جائے (یہ ہرگز نہیں ہوگا)۔ اللہ کی قسم! یہ لوگ فرض زکوٰۃ سے رسّی کا ٹکڑا بھی دینے سے انکار کریں گے تو میں ان سے لازماً جہاد کروں گا''۔ دیکھئے اس واقعہ میں حضرت ابوبکرؓ نے تمام صحابہؓ سے مشورہ تو کیا مگر ان کی رائے کے خلاف اپنی رائے پر عزم کر کے قتال مرتدین کا حکم نافذ فرما دیا۔ اور اگرچہ یہ حکم تمام صحابہ کرام j کی رائے کے خلاف تھا مگر سب نے بلا چون و چرا تسلیم کر لیا' کسی نے بھی ان کے خلاف آواز نہ اٹھائی' کیونکہ وہ مخلص تھے۔

واقعہ٧: حضرت ابوبکر h نے حضرت عمر h کو اپنی حیات میں ہی خلیفہ مقرر فرمایا تو آپؓ کی جرأت و بے باکی کی وجہ سے صحابہ j کو اُن کی خلافت سے اختلاف ہوا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق h کی خدمت میں حضرت علی و طلحہ i تشریف لائے اور دونوں نے دریافت کیا کہ آپؓ نے کس کو خلیفہ بنایا ہے؟ فرمایا عمر کو! دونوں صاحبوں نے کہا: آپ اپنے ربّ کو کیا جواب دیں گے؟ آپؓ نے فرمایا: کیا تم مجھ کو اللہ سے ڈراتے ہو؟ یقیناً میں اللہ کو اور عمر کو تم دونوں سے زیادہ جانتا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ سے عرض کر دوں گا کہ میں لوگوں پر بہترین اہلیت رکھنے والے کو خلیفہ بنا آیا ہوں۔ (۱۱۳) اس واقعہ سے

بھی امیر کے عزم ونفاذ کا معتبر ہونا معلوم ہوتا ہے۔حضرت ابوبکرؓ نے کسی کے مشورہ کو نہ مانا' بلکہ اپنے عزم پر عمل فرمایا۔

حضرت عمر h کا تعامل

حضرت سعد بن ابی وقاص h فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عباس i سے زیادہ حاضر دماغ 'زیادہ عقل مند'زیادہ علم والا اور زیادہ حلیم الطبع کسی کو نہیں دیکھا۔اور میں نے حضرت عمر بن الخطاب h کو دیکھا ہے کہ اُن سے مشکل کاموں میں مشورہ لیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ تمہارے لیے مشکل کام آ گیا۔ پھر آپؓ ان کے قول سے تجاوز نہ فرماتے تھے' حالانکہ آپؓ کے اردگرد اہل بدر مہاجرین وانصار ہوتے تھے۔(۱۱٤)

مذکورہ بالا روایت سے صاف پتا چلتا ہے کہ کثرت کے مقابلہ میں کسی منفرد کی بات پر عمل کرنا' جبکہ امام کو شرح صدر ہو جائے' جائز و درست ہے۔حضرت عمر h باوجود کبار صحابہ کرام j کی موجودگی کے ابن عباسؓ کی رائے کو ترجیح دیتے تھے' حتیٰ کہ آپؓ بعض اوقات کسی عورت کے مشورہ کو بھی قبول فرما لیا کرتے تھے۔ چنانچہ بیہقی میں حضرت ابن سیرینؒ سے مروی ہے کہ حضرت عمر h مشورہ فرمایا کرتے تھے یہاں تک کہ عورت سے بھی مشورہ لیتے تھے' پھر کبھی اس عورت کے مشورہ میں اچھی بات پاتے تو اس کو اختیار کر لیتے تھے۔(۱۱۵)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اصل دارومدار عزم امیر پر ہے' چاہے عورت کی بات سے بھی اس کو شرحِ صدر ہو جائے۔جیسا کہ ماقبل بحث میں صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت اُم سلمہ k کے مشورۂ نحر وحلق کے بارے میں یہ بات گزر چکی ہے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی کا ایک واقعہ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کا ممبر بننے کے لیے ایک مقامی رئیس شیخ زادے کی خواہش پوری نہ ہونے پر اس درجہ شورش اور فتنہ برپا ہو گیا تھا کہ مدرسہ بند ہو جانے کا خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔اس لیے مدرسہ کے اراکین اور مہتمم وغیرہ سب حضرات نے حضرت گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ حضرت! ایسے سنگین حالات میں اگر ان کو ممبر بنا لیا جائے تو یہ شر اور فتنہ بھی دفع ہو جائے گا اور بظاہر ضرر بھی کچھ نہ ہوگا' کیونکہ کثرت تو پھر بھی حضرت کے خدام ہی کی رہے گی۔ حضرت گنگوہی نے ان کی ممبری قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ مدرسہ کا مقصد رضائے الٰہی ہے' نااہل کو ممبر بنانے میں ہم سے مؤاخذہ ہوگا اور ممبر نہ بنانے سے اگر مدرسہ بند ہو گیا تو باز پرس اُن سے ہوگی۔اس جواب پر سب خاموش ہو کر اپنی رائے سے خالی الذہن ہو گئے' اور اس پر عمل کرنے سے سب شر

ختم ہوگیا۔(۱۱۶)

حکیم الاُمت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ارشادات

(۱) ''یہ بات اصولِ شرع واسلام سے ہے کہ کام دراصل ایک ہی شخص کی رائے سے ہوتا ہے اور اپنی اعانت کے لیے وہ دوسروں کی بھی رائے لے لیتا ہے۔اس مشورہ سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ معاملے کے سب پہلو اسے مستحضر ہوجاتے ہیں۔ جب سب پہلو نظر میں آجاویں تو اس کا کام یہ ہے کہ ان میں سے جو پہلو خود انتخاب کرلے اسی کا حکم دے دے' یہی طریق مشروع ومعقول ہے''۔(۱۱۷)

(۲) ''پس اپنی اپنی رائے یا کثرتِ رائے کا اتباع نہ کر' بلکہ واحد کا اتباع کرو''۔(۱۱۸)

شبہ : اسلامی وحدت کی ضرورت پر نظری یقین رکھنا اور عملی تطبیق نہ کرنا

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلامی وحدت آج کل کی ایک اہم ضرورت ہے اور بندۂ مؤمن کی دلی خواہش بھی ہے' خاص طور پر ایسے مقامات پر جہاں خاص طور پر مسلمان سخت امتحان اور مصیبتوں کا سامنا کررہے ہوں۔ایسے مواقع پر بعض اوقات اکثر مسلمانوں کی طرف سے حیرت اور اضطراب کا اظہار ہوتا ہے جب ان کے سامنے ایک سے زائد اسلامی جماعتیں مختلف طریقوں سے مصروفِ عمل ہوں اور اُن کے موقف بھی مختلف ہوں۔بعض اوقات ان کے پلیٹ فارم سے ایک دوسرے کے لیے متعصّبانہ انداز میں اظہارِ خیال ہوتا ہے جس کی وجہ سے عامۃ الناس مایوسی کا شکار نظر آنے لگتے ہیں۔تو اِس اشکال نے مجھے اس کا جواب اور حل لکھنے پر مجبور کیا' بالخصوص اس وجہ سے کہ اس کا کوئی وافی جواب موجود نہیں تھا۔ایک اور سبب جس نے مجھے جواب دینے پر مجبور کیا' وہ ہے اساسی نظریات اور عملی تحقیقِ وضع۔بعض اسلامی کارکن اسلامی وحدت کی ضرورت پر نظری یقین تو رکھتے ہیں لیکن عملی تطبیق کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ان میں سے بعض اسلامی جماعتوں کی حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کرتے' جس کی وجہ سے وہ اپنے تصرفات' آراء اور موقف میں غلطی کر جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بعض علماء متعدد اسلامی جماعتوں کو اسلامی وحدت اور اُمت کے لیے ناسور سمجھتے ہیں' تو پھر کیسے ممکن ہے کہ ایسی اسلامی جماعتوں کو اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے لیے ایک ہی پلیٹ فارم پر بلایا جائے؟اس مسئلے نے ان گروہوں کو مزید تقویت دی ہے جو اسلامی جماعتوں کو دراصل اسلامی وحدت کے لیے ناسور سمجھتے ہیں' جس کی وجہ سے ان جماعتوں کی اس غلط فہمی نے اُمت کو انتشار' تفرقہ' پارٹی بازی اور تعصب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

ماضی کی طرح آج بھی ایسے کئی نوجوان اور جماعتیں موجود ہیں جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ متعدد فقہی مذاہب ومسالک درست نہیں ہیں' اور علمی مدارس کے بارے میں بھی ان کی رائے اچھی نہیں ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ مختلف فقہی مذاہب کیوں ہیں اور ایک شرعی مسئلے میں متعدد آراء کیوں ہیں' جبکہ ہمارا

دین ایک ہے' قرآن ایک ہے اور سنت نبویؐ ایک ہے؟ اُس وقت کی اوضاع نے اِس غلط فہمی کو مزید تقویت دی جبکہ بعض مذاہب کے متبعین کا رویہ متعصّبانہ تھا۔ وہ دوسرے مذہب ومسلک کی آراء ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس صورت حال میں مخلص علماء کرام نے ماضی میں بھی اور موجودہ دَور میں بھی اپنا کردار ادا کیا۔ علماءِ حق نے اس علمی اختلاف کی حقیقت کو واضح کیا جو علماء کے درمیان چل پڑا تھا اور اس کے اسباب کی وضاحت کی' یعنی کسی مسئلے میں آراء کا مختلف ہونا ایک طبعی اور شرعی عمل ہے جو اپنے محل میں اسباب کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ چنانچہ جن اصحاب کو شکایت تھی' وہ دور کر دی گئی۔

اس طرح جماعت سازی کی مثال بھی اُس اختلاف کی تھی جو اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ جس طرح ایک علمی مسئلے میں ایک سے زائد آراء ممکن ہیں' حالانکہ ہمارا دین ایک ہے' اسی طرح اسلامی جماعت سازی بھی اسلام میں ایک طبعی اور شرعی عمل ہے۔ آج کل خاص طور پر ایک اور سبب جو کہ اسلامی جماعت سازی کی وجہ بنا ہے' وہ ہے دعاۃِ اسلامی کا طریق دعوت (یعنی منہج) میں اختلاف۔ ہر داعی کی کوشش ہے کہ اسلامی نظام کے لیے کام کرے اور اپنے مقصد اور ہدف کو حاصل کرنے کے لیے آسان سے آسان تر راستوں کو تلاش کرے۔ ایسے راستے جو قریب سے قریب تر اور آسان ہوں۔ چونکہ طریقۂ کار میں ہر داعی کا نقطۂ نظر مختلف ہے' وہ اپنے ماحول کو دیکھتے ہوئے اپنے راستے کا تعین کرتا ہے' لیکن غرض' مقصد اور ہدف سب کا ایک ہی ہوتا ہے اور وہ ہے اسلامی نظام کی حفاظت اور اس کا نفاذ۔ ان دعاۃ کی اس کوشش کی مثال اس حال میں جب کہ وحدتِ دین ہو اور قرآن وسنت اصل مصدر ہوں' انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے منہج کی طرح ہے' کیونکہ انبیاء کا طریقۂ دعوت تو مختلف تھا' شرائع بھی مختلف تھیں' لیکن ملت ایک تھی۔ جیسا کہ کفر ملتِ واحدہ ہے۔ وحدتِ ملت انبیاء کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ﴾

(الانعام:۱۶۱)

''آپ کہہ دیجیے کہ مجھ کو میرے ربّ نے ایک سیدھا راستہ بتلا دیا ہے کہ وہ ایک مستحکم دین ہے' جو طریقہ ہے ابراہیم کا' جس میں ذرا کجی نہیں۔''

اور اسی طرح فرمان ہے:

﴿ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا﴾ (النحل:۱۲۳)

''پھر ہم نے آپ کی جانب وحی بھیجی کہ آپ ملت ابراہیم حنیف کی پیروی کریں۔''

اور اسی طرح ملت کفار کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ (البقرۃ:۱۲۰)

''آپ سے یہود ونصاریٰ ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے تابع نہ بن

جائیں (یعنی یہودیت یا نصرانیت اختیار کرلیں)''۔

انبیاء اور دعاۃ کی جدوجہد اور دعوت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انبیاء کا طریقہ مختلف ہونے کے باوجود ملت ایک تھی۔(۱۱۹) لیکن جس طرح انبیاء معصوم عن الخطا (یعنی خطا سے پاک) ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے' بالکل اسی طرح دعاۃ کا طریقۂ کار مختلف ہونے کے باوجود ان کا دین اور رسالت ایک ہے۔ لیکن دعاۃ اور علماء کے اجتہادات میں وحی کی روشنی میں ایک بشر (انسان) ہونے کے ناطے غلطی اور صواب دونوں کا امکان موجود رہتا ہے جو کہ قابل نقد اور مناقشہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں وہ اجر سے کسی حال میں محروم نہیں رہتے۔ اِن شاء اللہ!

شبہ: بیعت صرف اسلامی ریاست کے حکمران سے متعلق ہے

رہا یہ اشکال کہ بیعت صرف اسلامی ریاست کے حکمران سے متعلق ہے اور عدم وجود کی صورت میں کسی کے لیے جائز نہیں ہے' کیونکہ ایک تو یہ باب مفاعلہ سے ''مبایعۃ'' ہے' اور لینے اور دینے والی صورت غیر حاکم کے لیے نہیں بنتی جب تک کہ وہ یہ دعویٰ نہ کرے کہ میں امیر عام ہوں یا یہ کہ ہمارے پاس ابھی کسی اسلامی ریاست کا وجود نہیں ہے۔ سابقہ انبیاء اور ان کی اُمتوں کے مکمل حالات ہمیں معلوم نہیں' ان کے متعلق کسی بات کا دعویٰ کرنا دعویٰ بلا دلیل ہے۔ اور اگر معلوم ہوں بھی تو ہم محمد ﷺ کی اُمت ہیں' کسی اور پیغمبر کی نہیں' ہمارے لیے آپ ﷺ کا اسوہ ہی کافی ہے۔ چنانچہ میں اسی کو سامنے رکھ کر بات کروں گا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے مکمل احکام تقریباً تیئیس برس میں اترے۔ جتنے احکام اترتے' مسلمان ان پر عمل کرتے۔ ان میں سے کچھ احکام مکہ مکرمہ میں اترے اور کچھ مدینہ میں' مگر دین مکمل ہونے کے بعد اب تمام احکام پر قیامت تک کے لیے عمل لازم ہے۔ اس میں وہ استثناء تو ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ:۲۸۶) ''اللہ تعالیٰ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے مطابق'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن:۱۶) ''پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تم میں طاقت ہے''۔ مگر یہ استثناء نہیں ہوسکتا کہ فلاں فلاں چیزیں چونکہ اسلامی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد فرض ہوئیں اس لیے وہ اِس وقت فرض نہیں۔ اگر یہی فلسفہ عمل میں لایا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اذان' اقامت اور نماز باجماعت اس وقت تک فرض نہیں ہوئیں جب تک اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی۔ اموال میں اڑھائی فیصد زکوٰۃ' مواشی میں ایک خاص نصاب کے مطابق صدقہ اور زمین کی آمدنی سے عشر اُس وقت تک فرض نہیں ہوا جب تک اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی۔ رمضان کے روزے اس وقت تک فرض نہیں ہوئے جب تک اسلامی ریاست کے قیام کو ڈیڑھ سال نہیں گزرا۔ شراب اُس وقت تک حرام نہیں ہوئی جب تک اسلامی ریاست کے قیام کے بعد چھٹا یا آٹھواں سال شروع نہیں ہوا۔(۱۲۰) متعہ کی حرمت کا واضح اعلان آپ ﷺ نے خیبر کے موقع پر اس وقت کیا جب اسلامی ریاست

کے قیام کو چھ برس گزر چکے تھے۔اسی طرح گھریلو گدھے کی حرمت کا اعلان بھی اُسی وقت ہوا۔(۱۲۱)سود کی حرمت کی آیات اس وقت تک نہیں اُتریں جب تک اسلامی ریاست قائم ہونے کے بعد دوسرے تمام احکام مکمل نہیں ہوئے۔یہ تقریباً دس ہجری کی بات ہے۔صحیح بخاری میں ابن عباس i فرماتے ہیں:

آخر ما انزل علی رسول اللہ ﷺ آیة الربا(۱۲۲)

''رسول اللہ ﷺ پر سب سے آخر میں جو آیت اتری وہ سود کی آیت تھی۔''

آپ کے کہنے کے مطابق ہمارے پاس ابھی کسی اسلامی ریاست کا وجود نہیں تو نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ جب تک اسلامی ریاست وجود میں نہیں آتی اس وقت تک اذان' اقامت اور باجماعت نماز فرض نہیں ہے۔اسلامی ریاست کے قیام تک اس نصاب کے مطابق زکوٰۃ بھی فرض نہیں ہے۔رمضان کے روزے بھی اسلامی ریاست قائم ہونے تک فرض نہیں۔اسلامی ریاست کے قیام تک شراب بھی حلال ہے اور اس پر کوئی حد نہیں۔متعہ سے لطف اندوز ہونے کی گنجائش بھی اسلامی ریاست کے قیام تک موجود ہے اور اس وقت تک گدھوں کا گوشت بھی کھایا جاسکتا ہے جب تک اسلامی ریاست وجود میں نہیں آتی۔اسی طرح سود کا لین دین بھی جائز ہے۔اور آپ کے فلسفے کو اگر مزید آگے بڑھایا جائے تو اسلامی ریاست کے قیام کے بعد بھی کم از کم چھ سال تک شراب حلال رہے گی' اتنی ہی مدت تک متعہ کی گنجائش باقی رہے گی' گدھے کا گوشت حلال رہے گا اور تقریباً دس سال تک سود جائز رہے گا۔زنا' چوری' بہتان وغیرہ کی حدیں بھی اسلامی ریاست کے قیام کے اتنے سال بعد شروع ہوں گی جتنے کہ رسول اللہ ﷺ کے اسلامی ریاست قائم کرنے کے بعد شروع ہوئیں۔تقریباً یہی بات وہ حضرات کہتے ہیں جن کا کہنا ہے کہ جب تک معاشرے کی اخلاقی حالت درست نہ ہو زنا کی حد لگانا ظلم ہے' جب تک معاشرے میں غربت اور معاشی ناہمواری ختم نہ ہو چور کا ہاتھ کاٹنا زیادتی ہے۔

نہیں میرے بھائی! یہ فلسفہ درست نہیں۔کوئی چیز اسلامی ریاست قائم ہونے سے پہلے فرض ہوئی یا بعد میں' اب وہ قیامت تک کے لیے فرض ہے اور جونہی اس فرض کو ادا کرنے کی استطاعت ہو' فوراً اسے ادا کرنا ہوگا۔اسی طرح کوئی چیز اسلامی ریاست قائم ہونے سے پہلے حرام ہوئی یا بعد میں' اب قیامت تک کے لیے حرام ہے۔جماعت سازی اور بیعت کا بھی یہی معاملہ ہے۔اگر اسلامی ریاست موجود نہ ہو تو اسلامی ریاست کو قائم کرنے کے لیے جو بھی کوشش کرے گا وہ یہی راستہ اپنائے گا' دوسرا اور تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔کیونکہ مذکورہ بالا فرائض کی ادائیگی اگر بغیر اسلامی ریاست وحکمران کے ایک مسلمان کرسکتا ہے تو اسی طرح اقامت دین کی جدوجہد کے لیے جماعت سازی اور مسنون بیعت فی المعروف بھی کرسکتا ہے۔لیکن اصل بات یہ نہیں ہے' بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہم کچھ کرتے نہیں' یا کرنے کے لیے تیار نہیں۔انسان جب کچھ کرنہیں سکتا یا کرتا نہیں تو اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنے کی بجائے اس کا نفس اسے بہلاتا ہے' فریب دیتا

ہے کہ نہیں تم بھی کچھ ہو۔ جولوگ پاکستان یا دنیا کے دیگر خطوں میں جاری اقامت دین کی جدوجہد کے لیے اٹھنے والی تحریکوں پر اعتراض کرتے ہیں درحقیقت ان کی نیت درست نہیں۔ یہ لوگ عملی کام سے جان چھڑانے کے لیے یہ بات کہتے ہیں کہ ہم اقامت دین کے کام کے منکر نہیں ہیں، ہم بھی نفاذ اسلام کے قائل ہیں۔ اور پھر جب انہیں کوئی کہتا ہے کہ آپ نفاذِ اسلام کے لیے اٹھتے کیوں نہیں ہیں؟ اور آپ کے پاس نفاذِ اسلام کے لیے کون سا مسنون طریقہ ہے؟ تو کہتے ہیں کہ ہم بھی اس طرح کوشش کے قائل ہیں، لیکن سبب یہ ہے..... وجہ یہ ہے..... رکاوٹ یہ ہے..... مانع یہ ہے .....وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اصل بات نہیں سمجھتے۔ ہماری اس بات کی دلیل کہ ان کی نیت خراب ہے، قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ♦﴾ (التوبة)

''اور اگر ان کا جہاد پر نکلنے کا ارادہ ہوتا تو اس کی تیاری ضرور کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کا اٹھنا پسند ہی نہ تھا اس لیے اس نے انہیں سست کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھ رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ''۔

آگے نہ جانے کے کچھ بہانے تو موجود ہیں۔ لیکن جب تیاری ہی نہیں کرتے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں، ان کی نیت خراب ہے۔ ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ترجوا النجاة ولم تسلک مسالکها

لا تجری السفینة علی الیبس(۱۲۳)

یعنی آپ کامیابی اور کامرانی بھی چاہتے ہیں اور کامیابی کا جو راستہ ہے وہ بھی نہیں اپناتے، یہ تو ایسے ہے جیسے خشک زمین پر کوئی کشتی چلائے۔ لیکن جیسے خشک زمین پر کشتی نہیں چل سکتی اسی طرح نفاذِ اسلام بغیر اجتماعی جدوجہد کے ناممکن ہے، اور اجتماعیت بغیر قیادت کے، اور قیادت بغیر سمع وطاعت کے ناممکن ہے۔ اس لیے علماءِ نجد کہتے ہیں: **لا اسلام الا بالامارة ولا امارة الا بالطاعة** 'اسلام بغیر امارت کے نہیں اور امارت بغیر طاعت کے نہیں''۔ لیکن کیا کیا جائے، یہ لوگ کام تو کرتے نہیں، الٹا اعتراضات اور اشکالات پیدا کرتے ہیں۔ پھر اگر ہم کچھ کہتے ہیں تو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایک عربی شاعر اپنی محبوبہ کے بارے میں کچھ اس طرح رقم طراز ہے:

ویلاه ان نظرتُ او ان هی اعرضتُ

وقع السهام نزعهن الیم(۱۲٤)

''ہلاکت اور بربادی ہے اگر دیکھوں تب بھی اور نہ دیکھوں تب بھی، کیونکہ تیر لگنے سے بھی درد ہوتا ہے اور نکالنے سے بھی''۔

بالکل اسی طرح اگر ہم دلیل پیش نہیں کرتے تو کہتے ہیں دلیل نہیں، اور اگر دلیل پیش کرتے ہیں تو یہ تأثر ملتا

ہے کہ آپس میں جھگڑا اور تفرقہ بازی ہے' اور یہ لوگ ان دلائل پر عمل بھی نہیں کرتے' جیسا کہ اوپر اصل کیفیت نقل کر دی گئی ہے۔ اس کیفیت کی مزید وضاحت کے لیے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی رائے پیش خدمت ہے۔ مولانا مودودیؒ نے فرمایا ہے:

''اگر آپ کا بچہ بیمار ہو تو آپ اس کی زندگی و موت کے سوال کو بالکلیہ کسی دوسرے پر ہرگز نہیں چھوڑ سکتے۔ ممکن نہیں کہ آپ یہ عذر کر کے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں کہ کوئی تیماردار نہیں' کوئی دوا لانے والا نہیں' کوئی ڈاکٹر کے پاس جانے والا نہیں۔ اگر کوئی نہ ہو تو آپ سب کچھ خود بنیں گے' کیونکہ بچہ کسی دوسرے کا نہیں' آپ کا اپنا ہے۔ سوتیلا باپ تو بچے کو مرنے کے لیے چھوڑ بھی سکتا ہے مگر حقیقی باپ اپنے جگر کے ٹکڑے کو کیسے چھوڑ دے گا! اس کے تو دل میں آگ لگی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کام سے بھی اگر آپ کا قلبی تعلق ہو تو آپ دوسروں پر نہیں چھوڑ سکتے اور نہ یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے کی نااہلی یا غلط روی یا بے توجہی کو بہانہ بنا کر آپ اسے مرجانے دیں گے اور اپنے دوسرے مشاغل میں جا کر منہمک ہو جائیں گے۔ یہ سب باتیں اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ خدا کے دین اور اس کی اقامت و سربلندی کے مقصد سے آپ کا رشتہ محض ایک سوتیلا رشتہ ہے۔ حقیقی رشتہ ہو تو آپ میں سے ہر شخص اس راہ میں اپنی جان لڑا کر کام کرے۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر آپ اس راہ میں کم از کم اتنے قلبی لگاؤ کے بغیر قدم بڑھائیں گے جتنا آپ اپنے بیوی بچوں سے رکھتے ہیں تو انجام پسپائی کے سوا کچھ نہ ہوگا اور یہ ایسی بُری پسپائی ہوگی کہ مدتوں تک ہماری نسلیں اس تحریک کا نام لینے کی جرأت بھی نہ کر سکیں گی۔ بڑے بڑے اقدامات کا نام لینے سے پہلے اپنی قوتِ قلب کا' اپنی اخلاقی طاقت کا جائزہ لیجیے اور مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے جس دل گردے کی ضرورت ہے وہ اپنے اندر پیدا کیجیے۔''(۱۲۵)

محترم بھائیو! ''ملک خدائے ماست'' کے مصداق یہ ملک ہمارا ہے' اسلام ہمارا ہے' قرآن ہمارا ہے۔ جب ہمارے ملک میں اسلام نافذ نہیں' قرآن نافذ نہیں تو ان کے نفاذ کے لیے ہمیں کوشش کرنا ہوگی' کوئی ہمارے ساتھ ہو یا نہ ہو۔ اور یہ کوشش رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں ہونی چاہیے نہ کہ یورپ اور غیر سے درآمد شدہ طریقوں پر۔

گزشتہ سے پیوستہ چند ضروری باتیں

ملک وملت کی بڑی آزمائشیں

کسی ملک کے لیے بڑی آزمائشیں ہوتی ہیں اگر اس کی حکومت کا رُخ درست نہ ہو' لیکن اس سے بھی بڑی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ اس کی اپوزیشن کے عناصر محض منفی سوچ بچار رکھتے ہوں' مثبت حیثیت سے نہ ان کے پاس صحیح نظریہ ہو' نہ کردار اور نہ مردانِ کار۔ بلکہ وہ غلط سے غلط سلوگن اور ہتھکنڈے اختیار کرتے

ہوں اور برے سے برے عناصر کے ساتھ تعاون پر تیار ہوں۔ اور اس سے بھی زیادہ بڑی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ کوئی قوم خود اپنے بھلے برے سے بیگانہ ہو جائے اور اس کے افراد محض ذاتی زندگی بنانے اور کمائیاں سمیٹنے اور تفریحات سے لطف اٹھانے میں لگ جائیں۔ یہ کہنے کی جرأت کیسے کی جائے کہ ہمیں کون سی آزمائشیں اور کون کون سی بدقسمتی درپیش ہے۔ لیکن ایک بات کہی جاسکتی ہے کہ کچھ نہ کچھ مشکل امتحانی لمحات سے ہم گزر رہے ہیں اور کئی قوتیں ہمارے وجود کو مٹانے اور مسخ کرنے اور اسے دوسروں کی غلامی میں دینے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ ایسے حالات میں آپ سیاسی دائرے کو چھوڑ دیں اور جلسوں کو بھول جائیں' سیدھے اپنے عوام اور شہریوں تک پہنچئے اور ان سے انفرادی سطح پر دین و ایمان و آزادی اور سالمیتِ وطن کی بات کیجیے۔ لوگوں کے ذہنوں کو جمود اور انتشار کی حالت سے نکال کر دین برحق کے تقاضوں پر مرتکز کیجیے اور پیش آمدہ خطرات کی مزاحمت کے لیے انہیں تیار کیجیے۔

مطلوبہ قوت

ضرورت اس بات کی ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو آپ معاشرے کے کارآمد عناصر کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اٹھا کھڑا کریں جو دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں محض آپ کی تائید کرنے والے اور نعرے لگانے والے ہی نہ ہوں بلکہ وہ اس دعوت کو اپنی چیز سمجھیں۔ انہیں براہِ راست اس کا فہم حاصل ہونا چاہیے اور ان کے دلوں میں اس کی قدر ہونی چاہیے۔ اُن کے اندر اس کے لیے محنت اور قربانی کا جذبہ ہونا چاہیے' وہ نظامِ اسلام کے برپا ہونے کے لیے بے چین جذبات رکھتے ہوں' اس مہم میں ہمہ تن مصروف ہوں' ناواقف لوگوں کے شکوک و شبہات کے جواب دے سکیں' عام لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکیں' مایوسانہ رجحانات سے لوگوں کو نکال سکیں' مخالفین کی مخالفتوں کا مقابلہ کر سکیں اور شریر لوگوں کی شرارتوں کو ناکام کر سکیں۔ آپ انہیں کسی کام کے لیے پکاریں تو وہ چاروں طرف سے لبیک کہتے ہوئے لپکیں۔ دین اور خادمانِ دین کے معاندین اگر ارادۂ بد سے کوئی حرکت کریں تو وہ ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں' نظامِ حق کا قیام عمل میں آئے تو اپنے اندر سے اسے چلانے کے لیے باصلاحیت افراد فراہم کریں اور اُن کی بقیہ تعداد اس کا خیر مقدم کرنے والی اور خوش دلی سے اسے اپنے اوپر نافذ کرنے اور اسے آگے تک پھیلانے والی ہو' پھر دعوت اسلامی کی مسلسل چلتی رہنے والی مہم کے نتیجے میں ہر شعبۂ زندگی میں مردانِ کار ابھر آئیں۔ دفتروں میں' عدالتوں میں' وکلاء میں' اساتذہ میں' طلبہ میں' خواتین میں' تاجروں میں' مزدوروں میں' دکانداروں میں' صحافیوں میں' ادیبوں میں' ذرائع ابلاغ کے حلقوں میں' چھاؤنیوں میں' تھانوں میں' دیگر پرائیویٹ فرموں اور سرکاری محکموں میں خدا پرست' دیانت دار اور خادم خلق لوگوں کی تعداد تیزی سے بڑھے' یہاں تک کہ اگر اکثریت نہ بھی ہو تو کم سے کم ہر دائرے میں ہر سطح پر ہر صلاحیت کی ایک مؤثر و فعال اقلیت متحرک ہو جائے۔ جس لمحے تبدیلیٔ نظام کی یہ شرط پوری کر دی جائے گی بلاتأخیر غلبۂ اسلام کا دور

شروع ہوجائے گا' چاہے انقلابی راستے سے ہو یا انتخابی راستے سے۔

کام کیسے شروع کیا جائے؟

تو جن محبانِ دین کو کام کرنا ہو' جن کو حقیقت میں اپنے اندر کوئی بے چین جذبہ اسلامی انقلاب کے لیے محسوس ہوتا ہو اور جنہیں ناخوشگوار حالات کے موجودہ گھیرے کو توڑ کر بچ نکلنے اور تاریخ کے قلعے پر اسلام کا جھنڈا گاڑ دینے کی خواہش ہو' وہ مندرجہ بالا شرائط کو پورا کرنے کے لیے زور لگائیں' ورنہ سطح کے اوپر اوپر نعرے لگانے سے سارے خواب پریشان ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر سطح کے نیچے آپ کام نہ کریں گے تو کوئی دوسری قوت اپنا تانا بانا پھیلا دے گی۔ خیال رہے کہ ہماری اس سرزمین میں دیمک بہت ہے اور سیم بھی ہے' چوہے بھی سرنگیں کھودتے رہتے ہیں۔ آپ اگر اوپر کسی عمارت کے اٹھانے کا نقشہ بنائیں تو اس بات کی فکر پہلے کرلیں کہ سطح کے نیچے ایسی مؤثر قوت پیدا ہو جائے جو سیم اور دیمک اور چوہوں پر قابو پا سکے' کچھ ایسی مساعی جن کا محض یہ اثر ہو کہ ہمیں تاریک فضا میں اپنا وجود محسوس ہوتا رہے' یہ بھی بڑی اچھی بات ہے۔ مگر اصل فیصلہ کن امر یہ ہے کہ آپ کا وجود پھیلتا یا سکڑتا ہے یا جامد بن کر رہ جاتا ہے۔ اسے سکڑنے نہ دیجیے' اسے جامد بھی نہ ہونے دیجیے' بلکہ اس میں پھیلاؤ پیدا کرنے کی تدبیر کیجیے' اس کا حجم بھی بڑھے اور وزن بھی اور قدر و قیمت بھی۔ ایسا ارادہ ہو تو یہ سخت محنت و مشقت کا کام ہے۔ فیصلہ کر لیجیے کہ آپ کو محنت و مشقت سے یہ مہم چلانی ہے' نہیں چلائیں گے تو آپ کا پہاڑ جیسا وجود بھی گھلتے گھلتے رائی بن کر رہ جائے گا۔ اور ایسی مہمات چلانے کے لیے کوئی ایک بنی بنائی ڈگر ہر قسم کی حالت میں کام نہیں دیتی' بلکہ بنی بنائی ڈگر پر چلتے چلتے بسا اوقات ذہنی جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈگر کو چھوڑیے اور جمود کو توڑیے!

طوبیٰ للغرباء

فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (آل عمران) ''اور نہ ڈھیلے پڑو نہ دلگیر ہو جاؤ اور تم ہی (آخرکار) غالب آؤ گے بشرطیکہ تم ایمان والے ہو''۔ اور پھر یوں محسوس ہوتا ہے کہ خدا کے فرشتے ہر طرف سے آ آ کر کان میں کہہ رہے ہیں کہ ﴿اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۰) ''نہ خوف رکھو نہ ملال''۔

پس ہزار ہدیۂ تبریک (طُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ) خدا کے دین کے ہر اُس سپاہی کے لیے جس نے مخالفتوں کے ماحول میں بار بار اجنبی بن کر ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ (المائدۃ:۸) ''خدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے شاہد بن کر اٹھو'' کا تقاضا پورا کیا' جس نے گالیاں کھا کر' جھوٹے الزام سن کر' تضحیک کا نشانہ بن کر' کفر کے فتووں کے وار سہہ کر' تفرقہ باز مذہبی پیشواؤں کے فتنوں کا مقابلہ کر کے اور سرکاری عتاب کے تازیانے کھا کر اپنا وہ بڑا اجتماعی فرض ادا کیا جس کا عہد کلمۂ اسلام پڑھنے والا ہر شخص

خدا سے استوار کرتا ہے۔ ایسے لوگ شہر شہر گاؤں گاؤں سے ایک ایک‘ دو دو کر کے ﴿مَثْنٰی وَفُرَادٰی﴾ (سبا:٤٦) اٹھنے والے بے مزد سپاہی جب وسائل کے ساتھ بھی اور بے سروسامانی کے عالم میں بھی ﴿خِفَافًا وَّثِقَالًا﴾(التوبۃ: ٤١) نکل کھڑے ہوئے تو اس چھوٹی سی قوت کے ہاتھوں تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل گیا۔ ان کی منظّم کوششوں سے کلمۃ اللہ کی گونج بڑھتی ہی گئی۔

اگر دعوتِ حق کے علمبردار اپنے آپ کو اس کیفیت میں پاتے ہیں تو آج کے حالات کی پیچیدگی کوئی ایسی مردافگن نہیں ہے کہ سپاہیانِ حق جی چھوڑ کر کمریں کھول دیں اور قلزمِ تاریخ کے ساحل پر اونگھتے ہوئے موجوں اور مختلف پیراکوں کی کشمکش کا تماشا کرتے رہیں۔ اگر ہمیں خدا نے پہلے بارہا خوفناک طوفانوں کا منہ پھیر دینے کی توفیق دی ہے تو آج بھی یہی ہوگا‘ لیکن اندر کی ایمانی کیفیت کمزور پڑ گئی تو پھر باہر کے سارے مسائل کو لپیٹ کر رکھ دیجیے اور گھر کے اندر کی خبر لیجیے۔

رسول اللہ ﷺ کی جماعت کی خصوصیات

آیئے ذرا سوچیں! نبی کریم ﷺ کی پکار پر اٹھنے اور آنحضور ﷺ سے تعلیم و تربیت پانے والی جماعت کی غیر معمولی قوت کا راز کیا تھا؟ اس کا راز یہ تھا کہ جو لوگ‘ جو ہستیاں اس میں شریک ہوتی تھیں‘ جن سے یہ جماعت مرکب تھی‘ ان ہستیوں نے ایک کلمے کے اوپر سودا کر لیا تھا اپنی جان و مال کا اور اپنی پسند و ناپسند کے اختیار کا‘ صرف ایک چیز کے بدلے میں کہ خدا کی خوشنودی حاصل ہو اور خدا کی جنت میں جگہ ملے‘ پھر اپنی ساری چیزیں انہوں نے ملا کر ڈھیر کر دیں جماعت کے آگے‘ تحریک کے آگے‘ اس انقلابی مہم کے آگے جو نبی ﷺ نے اٹھائی تھی۔ بیعت کی اور بیعت کے اندر یہ معاہدہ کیا کہ ہم نے اپنا سب کچھ پیش کر دیا۔ قرآن کریم میں اس کا ریکارڈ موجود ہے۔ یہ میں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ وہ جو ساری تبدیلی واقع ہوئی تھی وہ اس وجہ سے واقع ہوئی تھی کہ وہاں جان و مال کا سودا کر کے آنے والے لوگ موجود تھے‘ جنہوں نے ہمہ تن اپنے آپ کو پیش کر دیا تھا اور ان کے ذریعے وہ تبدیلی آئی جس تبدیلی کے اثرات سے تاریخ آج بھی بھری پڑی ہے۔

غیر منظّم کوششیں

لیکن اگر آپ یہ چاہیں کہ اصل فوج یعنی ہمہ وقت ہر قسم کی قوتیں لگانے والی فوج محاذ پر موجود نہ ہو اور اگر ہو تو بڑی قلیل‘ تعداد برائے نام ہو‘ لیکن محاذ کے پیچھے اسلام کے شائق عام نعرہ باز اسلام کو پسند کرنے والے اور غلبۂ اسلام کو چاہنے والے موجود رہیں‘ بکھرے بکھرے‘ متفرق‘ جن میں سے کسی کا جی چاہے تو وہ چار پیسے خدا کی راہ میں خرچ کر دے‘ کسی کو شوق ہو تو کوئی کتاب لے کر پڑھ لے‘ کسی کا جی چاہے تو وہ جلسے میں شریک ہو جائے‘ کسی کا جی چاہے تو وہ کلمۂ خیر مخالفوں میں یا دوستوں میں بیٹھ کر کہہ

دے اور اس میں یہ آزادی ہے کہ وہ کیا کام کتنا کرے اور کتنا نہ کرے اس کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے' کوئی حساب لینے والا نہیں ہے اور وہ پابند نہیں ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔ وہ اس امر کا بھی پابند نہیں ہے کہ کوئی آدمی اس کو حکم دے سکے کہ اس کام کو یوں کرنا ہے' اس کام کو فلاں وقت کے لیے روک دینا ہے اور فلاں وقت پر شروع کرنا ہے۔ یہ حکم دینے والا کوئی نہیں کہ فلاں کے ساتھ تمہیں مل کر چلنا ہے اور فلاں کے ساتھ مل کر نہیں چلنا ہے' یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔

اس طرح کے آزاد رضا کاروں کے بل پر اگر دنیا کا نظام چل سکے تو میرا یہ خیال ہے کہ کسی ملک میں کسی فوج کی ضرورت نہیں۔ تمام لوگ رضا کارانہ طور پر کہیں کہ جب کوئی حملہ ہوگا تو ہماری فوج حاضر ہے' ہمارا مال حاضر ہے اور ہم پروپیگنڈا بھی کرتے رہیں گے اور دعائیں بھی دیتے رہیں گے۔ لیکن یہ آپ جانتے ہیں کہ اس طرح کے رضا کاروں کی ٹیم کے اوپر اور کسی بکھری ہوئی قوت کے اوپر کسی ملک کے دفاع کا انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ محرک قوت جو ہمدردوں' خیر خواہوں اور رضا کاروں سے ان کے اپنے آزاد جذبے سے کچھ مشقتیں' کچھ خدمتیں انجام دلاتی ہے' وہ اپنا کام کرتی رہے اور اس سے پوری مہم چل جائے' یہ ممکن نہیں۔ البتہ اصل فوجی قوت اگر محاذ پر موجود ہو اور کافی تعداد میں موجود ہو اور کافی سامانِ جنگ اور وافر اسباب رسد کے ساتھ موجود ہو تو اس کو تھوڑی بہت بھی مدد اگر باہر سے پہنچتی رہے اور آس پاس سے اس کو تعاون حاصل ہوتا رہے تو وہ بہت بڑی مضبوط قوت بن جائے گی اور نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔

اسلامی انقلاب کے حامیوں سے اپیل

میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں ان لوگوں کی کوششوں کی کسی طرح بھی ناقدری کرنا چاہتا ہوں جو لوگ اگر کسی اسلامی انقلابی تنظیم میں کسی وجہ سے شامل نہیں بھی ہیں تو اس کے باوجود وہ اپنے جان و مال سے اس کے ساتھ تعاون کرتے ہیں' پس میں ان کی قدر کرتا ہوں اور ان کے لیے شکر گزاری کا جذبہ رکھتا ہوں۔ لیکن خدمت اسلام کا یہ طریقہ آئیڈیل نہیں ہے' یہ وہ مقام نہیں ہے جس مقام پر آپ وہ مقصد حاصل کر سکیں جس مقصد کا ذکر میں نے اشارتاً پہلے کیا ہے' اس مشن کے لیے مفید نہیں ہے جس مشن کے لیے ایک جماعت کا نظم کام کر رہا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ حقیقی فیصلہ کن قوت بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنے آپ کو احیاءِ دین اور نفاذِ شریعت کے لیے اٹھنے والی جماعت کی رکنیت کے مقام پر لائیں اور اس مقام پر نہایت مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوں اور اس کا حق ادا کریں۔ کسی بھی اسلامی تحریک میں شمولیت اور رکنیت کسی بیڈمنٹن کلب کی رکنیت و شمولیت کے برابر نہیں ہے' یہ کسی کاروباری فرم میں حصہ داری نہیں ہے' یہ کسی سیر و تفریح کی مجلس میں شرکت نہیں ہے۔ یہ کوئی سیاسی قسم کی پارٹی بازی اور گروہ بندی اور کسی فرقہ کی گروہ بندی نہیں ہے کہ جس میں آپ آئیں اور آپ کا نام لکھ دیا جائے اور اس میں آپ شریک ہو جائیں' بلکہ یہ نور ایمان کو اپنے اندر جذب کر کے شعوری طور پر پورے اسلام کو اپنے اوپر اور دنیا پر نافذ کرنے کا پروگرام

ہے۔اس پروگرام کو لے کر جن لوگوں کو اٹھنا ہو وہ اس جماعت کی طرف بڑھیں اور اس جماعت کی رکنیت قبول کریں۔لیکن رکن ہونے کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ آپ منزل تک پہنچ گئے اور یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات ایک انسان رکنیت سے پہلے نفاذِ اسلام کے لیے زیادہ سرگرم ہوتا ہے' لیکن رکنیت میں آنے کے بعد بخیالِ کارکن محسوس کیا جاتا ہے کہ انہوں نے منزل پالی اور منزل پالینے کے بعد جیسے ان پر نیند طاری ہوگئی ہو۔لیکن سمجھنے کی بات ہے' بلکہ خوب سمجھ لیجیے کہ آپ کے رکن بننے کے بعد آپ کی ذمہ داریوں کا اصل آغاز ہوتا ہے۔اور سب سے پہلی ذمہ داری ایک صاحب ایمان کی اور کسی بھی اسلامی نظام جماعت کے صحیح کارکن کی یہ ہے کہ وہ ایمان اور اسلام کو اپنے اوپر نافذ کرے۔ایمان اور اسلام کو اپنے اوپر نافذ کرنے کے معنی کیا ہیں؟ بقول نعیم صدیقی صاحب: یہ ہجرت کرنا ہے دراصل ایک طریق زندگی سے دوسرے طریق زندگی کی طرف' ایک طرح کی عادات سے دوسری طرح کی عادات کی طرف' ایک طرح کے افکار سے دوسری طرح کے افکار کی طرف' ایک طرح کے حالات سے دوسری طرح کے حالات کی طرف۔بہرحال جس زندگی میں ایمان داخل ہو جائے اس میں عبادات بھی پیدا ہونی چاہئیں' اس میں ذکر بھی پیدا ہونا چاہیے' اس میں علم بھی پیدا ہونا چاہیے' اس میں اخلاق بھی آ جانے چاہئیں' اس میں پابندیٔ نظامِ اوقات بھی اور شائستگیٔ اطوار بھی اور خیر وخوبی کی ہر دوسری چیز بھی اس میں آ جانی چاہیے اور یہ احساس بھی آ جانا چاہیے کہ میرے ذمہ کیا ذمہ داریاں ہیں۔

گزری ہوئی زندگی کا محاسبہ ☆

برادران اسلام! ابھی وقت ہے کہ ہم ذرا دور اندیشی سے کام لیں اور اپنی گزری ہوئی زندگی کا جائزہ لیں۔اپنے نفع ونقصان کا حساب لگائیں اور یہ دیکھیں کہ جس جنسِ زندگی اور اس کے ساز وسامان کو امانتاً لے کر اس دنیا کے بازار میں کچھ کمانے کے لیے آئے تھے ان کے ساتھ ہم نے کیا کیا؟ ان کا کس قدر حصہ نفع بخش کاموں میں لگایا' کس قدر اپنی نادانی سے بے کار کھو دیا اور کس قدر ـــــ دانستہ ونادانستہ ـــــ اس صاحب امانت کے منشاء بلکہ اس کے صریح احکام وہدایات کے خلاف دوسرے کاموں میں خرچ کر ڈالا۔ہاں' ابھی وقت ہے کہ یہ سوچیں کہ جس قدر سرمایہ ہم سے کھو گیا یا ہم نے کھو دیا' کیا اس کے لیے ہمارے پاس کوئی ایسے معقول وجوہ موجود ہیں کہ اس سفرِ دنیا سے واپسی پر جب ہم اپنے اس علیم وخبیر' خالق ومالک

☆ یہ دراصل میاں طفیل محمد صاحب سابق امیر جماعت اسلامی کی لکھی ہوئی ایک تحریر سے اقتباس ہے' جو ابتداءً محرم ۱۳۶۴ھ میں ایک پیغام کی صورت میں شائع ہوئی تھی۔پھر کچھ اضافے کے ساتھ اسے ''دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات'' میں شامل کر دیا گیا اور جولائی ۱۹۷۶ء سے یہ مضمون مکمل نظر ثانی کے ساتھ جماعت اسلامی کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔مضمون کی افادیت کے پیش نظر ہم اس کو اپنے مضمون کا آخری حصہ بنا کر اور کچھ اقتباسات اس مضمون سے اخذ کر کے اسے خادمین اسلام کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔(ق۔ی)

اور صاحبِ امانت کے سامنے حساب کے لیے بلائے جائیں تو درجات و مراتب پانے والے نہ سہی قابل درگزر رہی قرار پا جائیں؟ اس لیے ان تمام لوگوں کو جو اللہ، اس کی کتاب، اس کے رسول اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جزا و سزا کے قائل ہیں عموماً اور ان حضرات کو جو **خیر امۃ** (۱۲۶) اور **شهداء على الناس** (۱۲۷) میں شمار ہونے کی تمنا اور **له الخلق و الامر** (۱۲۸) کا عملی پروگرام لے کر اٹھے ہیں خصوصاً اپنی گزشتہ زندگی اور اپنے اب تک کے کارناموں کا محاسبہ کر کے اندازہ کرنا چاہیے کہ اپنی زندگی کا جو سرمایہ وہ ختم کر چکے ہیں اس کا کس قدر حصہ صاحب امانت کے منشاء کے مطابق، اس مقصد کے لیے صرف ہوا جس کے لیے یہ امانت انہیں عطا کی گئی تھی اور اس کا کس قدر حصہ انہوں نے اپنی نادانی یا سرکشی سے، اس کے منشاء کے خلاف خرچ کر ڈالا ہے اور اب تک کیے جا رہے ہیں۔

ان امور کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے کے لیے ہر شخص کو پوری جزرسی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے کہ ہماری جسمانی و دماغی قوتیں اور قابلیتیں، ہماری انفرادی اور اجتماعی جدوجہد اور کوششیں، ہمارے کاروبار اور تجارتیں، ہماری محبتیں اور عداوتیں، ہماری زیر تربیت آئندہ نسلیں، ہمارے مال و دولت اور جائیدادیں، مختصر یہ کہ زندگی کے وہ تمام ذرائع و وسائل جو اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی عبادت و بندگی اور فریضۂ خلافت کی انجام دہی کے لیے ہمیں عطا فرمائے تھے، اب تک کن کاموں اور کن مقاصد کے لیے صرف ہوتے رہے؟ کیا وہ تمام تر یا بیشتر نظام باطل کے قیام، خدا سے بے نیاز و سرکش اقتدار کے استحکام اور خدا کی زمین پر فتنہ و فساد پھیلانے ہی کے لیے وقف رہے یا ان کا کوئی حصہ خدا اور اس کے دین کے لیے بھی صرف ہوا؟ اور کچھ صرف ہوا تو باطل نظام ہائے زندگی اور خود اپنے نفس کے لیے صرف ہونے والے حصہ سے اُس کا تناسب کیا ہے؟ اگر آخرت کی کچھ بھی فکر ہے تو ہمیں سنجیدگی سے حساب لگا کر دیکھنا چاہیے کہ ہماری جملہ مادی، جسمانی اور دماغی قوتیں اور قابلیتیں خدا سے بے نیازی و بغاوت پر مبنی نظامِ زندگی کو چلانے اور مستحکم کرنے میں کتنا حصہ لیتی رہیں اور لے رہی ہیں اور اس انسانی زندگی (۱۲۹) کے نظام کو خدا کی بندگی پر قائم اور دنیا کو اس کی نافرمانی اور شر و فساد سے پاک کرنے میں کتنا حصہ لیتی رہیں اور لے رہی ہیں؟ ہماری انفرادی اور اجتماعی کاوشیں کس حد تک مصنوعی اور خود ساختہ، زندہ و مردہ خداؤں کی خدائی کو قائم کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے وقف ہیں اور کس حد تک اللہ کی حاکمیت اور اس کے مشروع نظامِ زندگی کے قیام کے لیے صرف ہو رہی ہیں؟ ہمارے کاروبار اور تجارتیں کہاں تک اللہ کی حدود و حرام و حلال کے مطابق چل رہے ہیں اور کہاں تک اُن سے آزاد اور بے پرواہ ہو کر؟ ہماری ساری دوڑ دھوپ اور مصروفیتیں مرغوباتِ نفس اور قربِ طاغوت کے لیے ہیں یا رضائے الٰہی کے حصول کے لیے؟ اپنی آئندہ نسلوں کو ہم اللہ کی پسندیدہ راہ پر چلنے اور اس کی خوشنودی کی خاطر جینے اور مرنے کے لیے تیار کر رہے ہیں یا اپنی اس عزیز ترین متاع کو ''مغضوب'' اور ''ضالین'' کے قدم بقدم چلنے کے قابل بنانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں؟

ہمارے مال و دولت اور دوسرے وسائل زندگی کا کتنا حصہ طاغوت کے لیے ہے‘ کتنا خود اپنے نفس کے لیے اور کتنا دین حق کی جدوجہد کو پروان چڑھانے کے لیے؟ اور پھر مسلمانوں نے اپنا کتنا خون جس کی قیمت ایک مسلمان اپنے ربّ سے عہد وفاداری استوار کرتے ہی وصول (۱۳۰) کر لیتا ہے‘ طاغوت کی وفاداری میں بہایا اور بے دریغ بہائے بہائے چلے جا رہے ہیں اور اس کی حاکمیت واقتدار کی حمایت میں کتنے بچوں کو یتیم‘ سہاگنوں کو بیوہ‘ ماؤں کو بے سہارا‘ بھائیوں کو بے بازو اور خلق خدا کو تباہ و برباد کر دیا؟☆

ذرا سوچیے ! ضد میں مبتلا ہو کر نہیں‘ ٹھنڈے دل سے اور آخرت کے نقطۂ نظر سے سوچیے کہ کیا اس کی تلافی کی کوئی صورت ممکن ہے؟ یہی نہیں‘ اس وقت بھی آپ بتائیے کہ ہماری روزانہ کی زندگی کے چوبیس گھنٹوں اور خدا کے عطا کردہ مال میں سے کتنا وقت اور مال غیر اللہ کے لیے وقف ہے اور کتنا قیامِ دین کی جدوجہد کے لیے اور اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے کے لیے؟ اللہ تعالیٰ نے تو ہمارا کام یہ بتایا تھا کہ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾(آل عمران: ۱۱۰) ’’اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے‘ تم نیکی کا حکم دیتے ہو‘ بدی سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو‘‘۔ اگر ایک مسلمان ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ذرا ٹھنڈے دل سے چند منٹ کے لیے اپنی زندگی پر نگاہ ڈالے تو وہ خود ہی فیصلہ کر لے گا کہ اس نے اس امانت کا حق جو اس کے خالق اور مالک نے اس کے سپرد کی تھی‘ کہاں تک ادا کیا ہے‘ اللہ کے ہاں اسے کس سلوک کا مستحق ہونا چاہیے اور جس دین اور عقیدے کا وہ دعوے دار ہے اس میں کس قدر صادق اور کس قدر منافق ہے! اور وہ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۘ﴾(البقرۃ) ’’لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو کہتے تو ہیں کہ وہ اللہ اور یومِ آخرت کو مانتے ہیں لیکن (ان کی عملی زندگی گواہ ہے کہ) وہ مؤمن نہیں ہیں‘‘۔ اور ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ﴾(البقرۃ:۱۶) ’’یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی مگر یہ سودا ان کے لیے نفع بخش نہیں ہے‘‘ کے زمرے سے بچا ہوا ہے یا ان میں شامل ہے۔

☆ واضح رہے کہ یہ مضمون دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں لکھا گیا تھا جس وقت ہزاروں لاکھوں مسلمان انگریزوں کی فوج میں یہ خدمت انجام دے رہے تھے‘ لیکن آج کے زمانے پر قیاس کریں تو آج بھی ہم اس زمانے سے پیچھے تو نہیں ہیں‘ اور حیرت ہے کہ ریت کے ذرے بھی اتنی تعداد میں کسی خطہ ارض میں جمع ہو جائیں تو اسے ریگستان بنا دیتے ہیں اور پانی کے قطرے بھی اس تعداد میں کہیں جمع ہو جائیں تو وہ سیلاب بن کر بہہ نکلتے ہیں‘ لیکن دنیا میں اتنے مسلمان موجود ہوتے ہوئے بھی نظام اسلامی کہیں قائم نہیں۔ اور ہمارے تمام اسلامی ممالک اور ان کے حکمران تو آج براہِ راست مسلمانوں کے قتل عام میں شریک ہیں اور انگریزوں کے حلیف بنے ہوئے ہیں اور ان سے دو قدم آگے ہیں۔ خدا کے لیے خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنے اعمال پر تنقیدی نگاہ ڈالیے‘ یہود کے نقشِ قدم پر چلتے رہو گے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہود کا سا برتاؤ آپ کے ساتھ نہ کیا جائے!

بہرحال مذکورہ ارشاداتِ الٰہی کی صراحت فرماتے ہوئے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))(۱۳۱)

''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنی خواہش نفس کو اس چیز کے تابع نہ کردے جو مَیں لے کر آیا ہوں۔''

خلاصۃ الکلام

قرآن وحدیث کی ان تصریحات سے یہ امر صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کی کتاب کو بنیادی ضابطۂ زندگی بنا کر اپنی پوری زندگی اس کے رسول ﷺ کی رہنمائی میں بسر کی جائے۔ ورنہ خدا اور رسول کی عملی اطاعت اور پیروی کے بغیر توحید کا محض اقرار ایک دعویٰ بلا دلیل ہے۔ کلمہ توحید کے اقرار کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کے بعد اب اس آدمی کی پوری زندگی اور اس کے سارے معاملات' عقائد وافکار' اخلاق واطوار' تہذیب وتمدن' معیشت اور معاشرت' سیاست اور عدالت' انفرادی اور اجتماعی روابط' سب کا مرکز ومحور اور مبدأ ومرجع قرآن وسنت ہوں گے اور اس کی تمام سعی وجہد رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر ہوگی۔ لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دوسرے نظام ہائے زندگی کے بارے میں تو سبھی لوگ یہ خوب سمجھتے ہیں بلکہ پورے شرح صدر کے ساتھ اس پر عمل بھی کرتے ہیں کہ جس نظامِ زندگی اور رواج زمانہ کو اختیار کیا جائے اس کے فوائد وبرکات سے پوری طرح فیض یاب ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے دل ودماغ اور فکر ونظر سے لے کر لب ولہجہ اور شکل وشباہت تک سبھی کچھ اس کے مطابق ڈھال لینا چاہیے۔ لیکن اسلام اور اسلامی نظامِ زندگی کے بارے میں ان کا دستور یہ ہے کہ ان کی تمام برکات و حسنات صرف ان کا نام لے دینے اور زندہ باد کا نعرہ بلند کر دینے سے حاصل ہو جانی چاہئیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صاف صاف بتا دیا ہے کہ وہ نہ صرف واحد معبود (الٰہ النَّاس) ہے بلکہ وہی اپنی مخلوق کا پالنے والا (ربّ النَّاس) اور ان کا فرماں روائے حقیقی (مَلِکِ النَّاسِ) ہے۔ اس کے ساتھ نہ کوئی الوہیت میں شریک ہے نہ ربوبیت میں اور نہ بادشاہی میں' اور اس نے اپنے بندوں کو ایک پورا نظامِ زندگی دے کر انہیں حکم دیا ہے کہ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ﴾ (البقرۃ:۲۰۸) ''اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے (اپنے سب کچھ سمیت) اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو''۔

ظاہر بات ہے کہ جس معاملے میں بھی آدمی اسلام کی راہ اختیار نہیں کرتا اس میں شیطان ہی کی پیروی کرتا ہے۔ اس حکم کے ساتھ اللہ نے یہ بھی واضح فرما دیا ہے کہ: ﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (یوسف:۴۰) یعنی فیصلہ کرنے اور حکم دینے کے سارے اختیارات اللہ ہی کو ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس وقت مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بھی مندر کے بت کی حیثیت دے کر مسجد کی چار دیواری کے

اندر محدود رکھنے پر مصر ہیں کہ اسے بس پوجا کے وقت سجدہ کر لیا جائے لیکن زندگی کے باقی امور و معاملات میں اسے کوئی دخل نہ ہو، یا پھر زیادہ سے زیادہ یہ کہ جو اختیارات ان کے خود ساختہ فرماں روا اُن کے ربّ کو بخوشی دینے پر رضامند ہوں اس حد تک یہ اپنے ربّ کے احکام پر بھی عمل کر لیں مگر باقی تمام معاملاتِ زندگی شریعت الٰہی سے قطع نظر خدا سے سرکشی و بے نیازی پر مبنی نظامِ زندگی کی اطاعت اور بندگی میں ہی چلتے اور طے پاتے رہیں۔ اس طرزِ فکر کے مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اپنے ربّ کی مکمل اور غیر مشروط اطاعت کی راہ اختیار کرنے کی بجائے اس سے سودے بازی کرتا ہے اور: ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ (البقرۃ:۲۸۶) ''اللہ کسی متنفس پر اس کی طاقت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا'' کو حجت بنا کر ہر اُس شے کو اپنی وسعت سے باہر قرار دے لیتا ہے جس میں مال و جان کا کچھ بھی نقصان نظر آتا ہے یا جو نفس کو غیر مرغوب اور جسم و جان کے لیے کچھ تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔ کہیں ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ﴾ (البقرۃ:۱۹۵) ''اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو'' کو من گھڑت معنی پہنا کر نہ صرف اپنے لیے اقامت دین کی جدوجہد سے فرار اور نظامِ باطل سے سازگاری اور اس کی پشتیبانی تک کے لیے جواز نکال لیتا ہے، بلکہ ان میں سے بعض حضرات یہ بھول کر کہ ﴿یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾ (الانفال:۴۷، التوبۃ:۳۴، ھود:۱۹) ''وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں'' قرآن نے ان کفار و مشرکین کی صفت بیان کی تھی جو رسولِ خدا کی بلند کردہ دعوتِ شہادتِ حق کی راہ روکنے کے لیے اٹھے تھے، اپنے ملک میں اٹھنے والی اقامتِ دینِ حق کی دعوت سے عام لوگوں کو متنفر و منحرف کرنے اور باطل کی قوتوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذکورہ وسعت کا فیصلہ وہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اور حشر کے روز وہ انہی لوگوں کی زندگیوں سے ایک ایک واقعہ کو سامنے لا کر بتائے گا کہ کس طرح ان کے اپنے محبوب مقاصد اور مرغوب نفسی مشاغل کے لیے تو ساری ہی وسعتیں ان کے اندر موجود تھیں اور یہ عذرات اور بہانے صرف اس کے دین کی اقامت کی جدوجہد کی حد تک ہی ان کی راہ میں حائل ہوتے تھے۔

حیرت ہے ان حضرات پر، جب اپنے محبوب مفادات و مقاصد اور اعزازات کے حصول کا سوال ہوتا ہے تو اس راہ میں نہ وسعت کی کوئی کمی حائل ہوتی ہے نہ اپنے ہاتھوں ہلاکت میں پڑنے کا کوئی اندیشہ رکاوٹ بنتا ہے اور نہ قرآن مجید کے کسی حکم کی کوئی ادنیٰ خلاف ورزی ہوتی ہوئی ان کو نظر آتی ہے۔ صرف اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد کے مطالبہ پر اللہ کے کلام کی یہ تاویلات ان کو سوجھنے لگتی ہیں:

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِکِ النَّاسِ ۙ اِلٰہِ النَّاسِ ۙ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۙ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ ۧ﴾ (الناس)

''دعا کرو کہ میں اس اللہ کی پناہ مانگتا ہوں جو نوعِ انسانی کا خالق و پروردگار بھی ہے، مالک و فرماں روا بھی ہے اور خدا بھی، چھپ چھپ کر وسوسہ اندازی کرنے والے ہر شیطان سے، جو لوگوں کے

دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ شیاطین جن میں سے ہو یا شیاطین انس میں سے''

میں تمام اہل اسلام کو اوران بھائیوں اور بہنوں کو بالخصوص، جو اللہ کے دین کی اقامت اور سربلندی کی تحریک میں شریک ہیں یا عملاً شریک ہو چکے ہیں، توجہ دلاتا ہوں کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا جو عہد کلمۂ شہادت کے ذریعے کیا ہے اسے ہر آن اور ہر معاملے میں ملحوظ رکھیں اور اپنی پوری زندگی اور اس کے سارے معاملات کی عمارت اس عہد کی بنیاد پر تعمیر اور استوار کریں، یہاں تک کہ ہماری زبان سے نکلنے والا کوئی کلمہ، ہمارے دماغ میں آنے والا کوئی خیال، ہمارے ہاتھ، پاؤں اور دوسرے قویٰ سے سرزد ہونے والا کوئی فعل، ہماری روزانہ زندگی میں پیش آنے والے معاملات میں سے کوئی معاملہ بھی ہمارے اس عہد کے منافی نہ ہو، بلکہ ہمارے سب معاملات ومشاغل مثبت طور پر اللہ کے نازل کردہ نظامِ حیات کا عملی نمونہ اور اس کے آئینہ دار ہوں اور ہماری پوری زندگی اور اس کی مصروفیتیں شریعت الٰہی کی رسّی سے اطاعت الٰہی کے کھونٹے سے بندھی عقیدۂ توحید کے گرد اس طرح گھوم رہی ہوں کہ دنیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝﴾ (الذّٰریٰت) ''میں (اللہ) نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس کام کے لیے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔ یعنی میری مقرر کردہ راہِ حیات سے سرمو اِدھر اُدھر نہ ہوں'' کی عملی تفسیر دیکھ لے۔ یہی اصل دین اور سچی خدا پرستی ہے، اسی کا نام تقویٰ اور پرہیزگاری ہے اور بس۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ!!

حواشی

(٦٤) بحواله: بوابة العرب نٹ مصر نگران احمد سعد الدين تاريخ ١٩٩١/٩/٨ بعنوان : البيعة: (ذكر بعض السلبيات وتقويمها)۔

(٦٥) د /يوسف القرضاوی (العمل الاسلامی الجماعی رأی واجتهاد بحواله القرضاوی نٹ تاريخ ٢٠٠٥/٥/٢٤ و اسلام اون لائن نٹ قسم بنك الفتوی۔

(٦٦) المفتی:د/جمال الدين عطية۔ البيعة فی الاسلام بحواله اسلام اون لائن بنك الفتوی۔

(٦٧) المفتی/فتحی يكن واستاد فتحی عبدالستار بحواله اسلام اون لائن نٹ۔

(٦٨) د/سليمان العودة۔البيعة فی الحركات الاسلامية۔ الاسلام اليوم نٹ۔

(٦٩) فتاویٰ ثنایہ، جلد دوم، ص ٦١٨۔

(٧٠) امارت و صدارت ، تاليف ممتاز احمد عبداللطيف ناشر مركز الاصلاح التعليمی الخيری، امواء، مدينة الشيخ، شيوهر، بهار انڈيا۔

(٧١) السلوك الاجتماعی فی الاسلام لحسن ايوب ، ص ٥١٢ و كتاب العمل الجماعی لمصطفی الطحان۔

(٧٢) سنن ابی داؤد، ج٣، ص ٣٦، ٣٧۔

(٧٣) د/محمد عبداللطيف البناء۔ عنوان الموضوع البيعة مفهومها ومدی مشروعيتها لغير الحاكم۔ عنوان السوال: ما مفهوم البيعة؟ وهل تجوز البيعة لغير الحاكم؟ بحواله اسلام اون لائن، تاريخ ٣٠/٤/٠٧۔

(٧٤) بحواله ماهنامه اوزبکستان المسلمة، سوال نمبر٧۔

(٧٥) بحواله الاسلام اليوم نٹ ١٤٢٨/٤/٢٩ المفتی وليد بن على الحسين پروفيسر استاد قسيم يونيورسٹی سعودی عربيه۔

(٧٦) طليعة التغيير والبناء٥۔ للشيخ رائد صلاح بحواله صحيفة الحق والحرية، تاريخ ٢٥ مايو٢٠٠٦۔File//D./5

(٧٧) نفس المصدر۔

(٧٨) نفس المصدر ومعالم فی الطريق وكتاب حول اساسيات المشروع الاسلامی لنهضة الامة قرأة فی فكر الامام الشهيد حسن البناء اعداد أ/د عبدالحميد الغزالی، ناشر دار التوزيع والنشر الاسلامية القاهرة۔

(٧٩) قانون النظام الاساسی لهيئة الاخوان المسلمين، ص ٧۔

(٨٠) عبدالله ناصح علوان سابق استاد الدراسات الاسلامية، كنگ عبدالعزيز يونيورسٹی جده سعودی عربيه۔ كتاب بين العمل الفردی والعمل الجماعی، ص٥٨ مضمون ناشر دار السلام للطباعة والنشر والتوزيع والترجمة۔

(٨١) تفهيم المسائل ج٢، ص ٢٧١ ازمولانا گوهر الرحمن m طبع مكتبة تفهيم القرآن مردان۔

(٨٢) تاريخ نجد از امام حسين بن غنام m۔ج٢، ص ٨٣،٨٤ حياة الشيخ محمد بن عبدالوهاب۔ تحقيق ناصر الدين الاسد۔ ناشر دار الشروق/بيروت قاهره الطبعة الرابعة ١٤١٥هـ —١٩٩٤ء۔

(٨٣) (ا) فتویٰ دار الافتاء دارالعلوم ديوبند انڈيا۔

(ب) صحيح البخاری،ج١٢، ص ٧١، مناقب زيد بن حارثه۔ والترمذی، ج١٢، ص ٢٩٨، مناقب زيد بن حارثه۔ و مسند احمد، ج١٢، ص ١٥٩۔

(٨٤) مرقات، ج١١، ص ٣٨٤، باب مناقب۔

(٨٥) مشكوٰة المصابيح، ص ٣١٩، قال الطيبی شبه رأسه بالزبيبة اما بصغره واما لان شعور رأسه مسقط تحقيرا لشانه ۔ مرقات ١٩٩/٧۔

(٨٦) اهتمام و شوریٰ، ص ٧٨ زمزم پبلشرز، كراچی۔

(٨٧) تفسير كبير، ج٤، ص ٥٣٤۔

(٨٨) انوار التنزيل، ج٢، ص ١٤۔

(٨٩) ابن كثير، ج١، ص ٥١٨۔

(٩٠) تفسير خازن، ج١، ص ٣٧٢۔

(٩١) الابواب والتراجم، ج٥، ص ٣٤۔

(٩٢) تفسير احمديه، ص ١٧٩۔

(٩٣) مشكوٰة، صفحه ٢٣١، آداب السفر۔

(٩٤) مشكوٰة شريف، باب الامارة، ص ٣٢٠۔

(٩٥) خلاصة التفاسير، ص ٣٩٩۔

(٩٦) اكسير هدايت، ص ٤٢٩۔

(٩٧) روح المعانی، ج٤، ص ١٠٧۔

(٩٨) تفسير جلالين، پاره٤، ص ٦٣۔

(٩٩) تفسير مدارك، پاره٤، ص ١٥٠۔

(١٠٠) تفسير مظهری، ج٢، ص ١٦٢۔

(١٠١) تفسير بيضاوی، ص٩٤۔

(١٠٢) تفسير روح البيان، ص ١١٦۔

(١٠٣) بيان القرآن، پاره٤، ص ٦٨۔٦٩۔

(١٠٤) احكام القرآن، ج٤، ص ٤١۔

(۱۰۵) احکام القرآن، ج۲، ص ۴۱۔ (۱۰۶) تفسیر کبیر، ج۳۳، ص ۱۹۵۔
(۱۰۷) مشکوٰۃ المصابیح، ص ۲۷۶۔ (۱۰۸) مشکوٰۃ المصابیح، ص ۳۰
(۱۰۹)حیاۃ الصحابۃ، ج۱، ص ۳۹۸۔ (۱۱۰) حیاۃ الصحابۃ، ج۱، ص ۴۔
(۱۱۱) سیرۃ الصدیق، ص ۲۸۴۔ (۱۱۲) سیرۃ الصدیق، ص ۲۹۱۔
(۱۱۳) حیاۃ الصحابۃ، ج۲، ص ۲۲۔ (۱۱۴) حیاۃ الصحابۃ، ج۲، ص ۴۱۔
(۱۱۵)حیاۃ الصحابۃ، ج۲، ص ۴۱۔ (۱۱۶) اہتمام و شوریٰ، ص ۲۵۔
(۱۱۷) دعوت و تبلیغ، مطبوعہ پاکستان بحوالہ اہتمام و شوریٰ، ص ۱۰۷
(۱۱۸) اصلاح، ص ۱۸۰، غایۃ النجاح، بحوالہ اہتمام و شوریٰ، ص ۱۰۷۔
(۱۱۹) تفسیر احسن البیان اردو، دارالسلام، ص ۲۶۷ برحاشیۃ ۱،سورۃ النحل۔
(۱۲۰) فتح الباری، کتاب الاشربۃ۔ (۱۲۱) صحیح البخاری و صحیح مسلم۔
(۱۲۲) بحوالہ تفسیر ابن کثیر۔ (۱۲۳) البلاغۃ الواضحۃ۔
(۱۲۴) نفس المصدر۔
(۱۲۵) بحوالہ ندائے خلافت، لاہور ۲۰۰۸ء، شمارہ ۴۔
(۱۲۶) ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آل عمران:۱۱۰)
(۱۲۷)﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾(البقرۃ:۱۴۳)
(۱۲۸)﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾ (الاعراف:۵۴) جب خلق اسی کی ہے تو حکم بھی اس کا چلنا چاہیے، یعنی جب مخلوق کے پیدا کرنے میں کوئی دوسرا شریک نہیں تو اس پر فرماں روائی اور حکم چلانے میں کوئی دوسرا شریک کیسے ہوسکتا ہے۔
(۱۲۹)﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران:۱۹) ''اللہ کے نزدیک انسانوں کے لیے صحیح طریق زندگی اسلام ہی ہے''۔﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ (آل عمران:۸۵) ''جو اسلام کے سوا کوئی اور طریق زندگی اختیار کرے گا اسے خدا کے ہاں قبولیت حاصل نہیں ہوگی''۔ ﴿وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدۃ:۳) ''میں (اللہ) نے اسلام کو تمہارے لیے نظامِ زندگی کے طور پر مقرر کیا ہے''۔
(۱۳۰)﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۭ﴾(التوبۃ:۱۱۱) ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں، چنانچہ مؤمن اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، (اللہ کے دشمنوں کو) قتل کرتے ہیں اور اور اپنی جانیں کھپاتے ہیں''۔
(۱۳۱) مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔

۞ ۞ ۞

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

PROLOGUE

All praise is due to Allah (SWT), who commenced His Book with praise and said: "*All praise is for Allah, the Lord of the worlds*", commenced His creation with praise and said: "*All praise is for Allah, who created the heavens and the earth and created darkness and light*" and concluded it with praise and said after mentioning the final destiny of the dwellers of Paradise and the tenants of Hell: "*And the decision will be made among them and it will be said that all praise is for Allah, the Lord of the worlds.*" For Him is all praise in this world as well as in the Hereafter. He revealed His ultimate guidance to His last Prophet (SAW) and brought mankind forth from darkness into light through it.

May Allah shower His blessings and mercy upon our beloved Prophet, Muhammad (SAW), who not only conveyed the message of Allah in the best manner, but also gave a perfect practical demonstration of it through his actions, as Ayesha (RA) said: "*His conduct was the Qur'an.*"

The Glorious *Qur'an*, the final word of the Lord of the worlds, a miracle of miracles, guidance for all humanity until the Day of Resurrection, is the greatest blessing of our Creator upon us. If there is anything to rejoice in this world, it is the *Qur'an* with its guidance that eliminates all shades of darkness and illuminates whatever it falls upon. The whole world with all its glitter is nothing compared to this blessing of Allah (SWT). Who would know better about its worth than the one who revealed it? He (SWT) says:

> *"O Mankind! Certainly an advice from your Lord and a cure for what is in the breasts and guidance and blessing for the believers has come to you. Say: (It is) through Allah's bounty and His blessing, so this is what they should celebrate. It is better than what they amass."* (*Surah Younus*: 56-57)

There are two levels of the understanding of the *Qur'an*. The basic level is '*Tazakkur*' i.e. seeking remembrance and guidance, for which this Book is the easiest and the most comprehendible of all Books. Allah (SWT) emphasizes this fact by mentioning it four times in *Surah Al-Qamar*:

> *"And most certainly, We have made the Qur'an easy for remembrance; is there then anyone to seek remembrance?"*

On the other hand, the higher level of the comprehension of the *Qur'an* is '*Tadabbur*' i.e. deep contemplation. At this level, the *Qur'an* is a boundless ocean with immeasurable depths. No one, even after spending one's whole life in learning and pondering over the words of the *Qur'an*, can ever claim to have completely explored its expanse or reached its depths.

Since the revelation of this wonderful Book, Allah (SWT) has been selecting some blessed souls from the *Ummah* of His last Prophet (SAW) for the privilege of serving it. Being the ultimate guidance for all humans, regardless of their race, nation, language and region, it needed to be translated into non-Arabic languages. Many great scholars devoted their lives to its learning, contemplation and elucidation. Many magnificent exegeses of this Book have been written.

Dr. Israr Ahmad is also one of those who have devoted their lives to the service of the Book of Allah. He started his *Ruju' Ilal Qur'an* (Reverting towards the *Qur'an*) movement in 1965. Since then, he, alongwith his companions, has been striving to propagate the message of the *Qur'an* to the masses. The *Daura-e-Tarjuma-e-Qur'an* in the nights of *Ramadhan* to call the Muslims, who have disassociated themselves from this rope of Allah back to it, is the cornerstone of this movement. The pages that follow are basically an edited form of the transcription of Dr. Israr's *Daura-e-Tarjuma-e-Qur'an*, delivered in English in the US. This is the first volume, comprising an introduction to the *Qur'an*, alongwith the translation, for which help has been taken from the translation by Abdullah Yusuf Ali, and brief elucidation of *surahs Al-Fatihah, Al-Baqarah* and *Aal-e-Imran*. Although effort has been made to make it as useful as possible for the readers, there is certainly room for improvement in it. It is not a detailed exegesis of the *Qur'an* and is meant to fulfill to some extent, the need of the basic level of the understanding of the *Qur'an* i.e. *Tazakkur*. Its main objective is to present the meaning of the *Qur'an* in an easily comprehendible way, with the hope that it may become a source of inspiration and revitalization of faith for the Muslims, specially their youth, may instigate them to devote their lives to the service of the final Divine Book, as the Prophet (SAW) said: *"The best among you are those who learn the Qur'an and teach it"* and may play a part in an Islamic Renaissance. And all help is from Allah alone.

Special thanks are due to Dr. Khursheed Ahmad, who was the main source of inspiration behind this project and also provided a lot of assistance to carry it out, and to Dr. Absar Ahmad, whose guidance made it possible for us to carry out this work. I also thank Dr. Nasir Malik, Shahran Iqbal and Zaid Mustafa for their effort and assistance in the editing and proofreading of this volume.

Atif Waheed
Islamic Research & Training Section
Qur'an Academy, Lahore

بِسْمِ اللّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

Introduction to the Qur'an

"Verily, We have revealed this Qur'an in Arabic (language) so that you may understand." *(12:2)*

The Arabic language is the most eloquent, plain, deep and expressive of all languages. The most honorable Book was revealed in the most honorable language, to the most honorable Prophet and Messenger (SAW), delivered by the most honorable angel (*Jibreel*) in the most honorable land on earth (*Makkah*), with its revelation starting during the most honorable month of the lunar year (*Ramadhan)*. The *Qur'an* [1] is perfect in every respect and is the greatest and the last of all Heavenly Books.

Central Theme and Purpose of Revelation

It is the word of the Lord of the Worlds, revealed to His Messenger, Muhammad (SAW) to bring mankind forth from darkness to light and to establish perfect justice on earth. The central theme that runs throughout the *Qur'an* is the exposition of the reality and the invitation to the right way. It declares that the same reality was revealed to Adam (AS) and all the Messengers after him, and that all the Prophets and Messengers preached the same right way. Thus the real objective of the Book is to call people to this "right way" and to illuminate Allah's true guidance, which has often been lost either through man's negligence and heedlessness, or distorted by his wicked perversity.

Addressees of the Qur'an

The first addressees of the *Qur'an* were the Arabs, who were from the progeny of *Ismail* (AS), the son of *Ibrahim* (AS). They were unlettered people and no Prophet had been sent to them before Muhammad (SAW). Secondly, the *Qur'an* addresses the people of the Book i.e. The Jews and the Christians, to whom the previous scriptures had been revealed and most of the Prophets sent before the advent of Prophet Muhammad (SAW). But as a whole, the *Qur'an* was revealed as guidance to the whole of Mankind, and not to a particular group or nation. It addresses innumerable varieties of people, remote from one another in time, space, and character, and still has such an easy way of explanation, such a purity of style and such a clear way of description, that it seems to be addressing a single, homogenous group, while each group feels that it is being addressed uniquely and specifically.

Preservation of the Qur'an

Allah (SWT) says:

> *"Verily We have sent down the Zikr (the Qur'an) and We are going to guard it."* [2]

Allah (SWT) revealed the previous Books for the people of a particular Prophet only, and not for the whole of mankind, and did not guarantee to preserve them. Their followers introduced alterations in them and distorted their meanings. The *Qur'an*, on the other hand, was revealed for all Mankind till the end of time. Being the final message, the *Qur'an* is preserved as a matter of Divine scheme in men's hearts and in written form, as is proven by events of history.

In another *ayah*, Allah (SWT) states:

> "*Surely this is a Glorious Qur'an, inscribed on the Preserved Tablet* (*Al-Lawh-ul- Mahfuz*)." [3]

And in *surah Al-Waqi'ah*, He (SWT) says:

> *"This is indeed a Glorious Qur'an, in a well-guarded Book."* [4]

Allah is protecting it from having anything added to or removed from it, and from being distorted. He is protecting its meanings from being twisted, just as He is protecting its words from being changed.

And in *surah Az-Zukhruf*, Allah says about the *Qur'an*:

> *"And verily it is in the Mother of the Book in Our Presence, high, full of wisdom."* [5]

This means that the actual *Qur'an* is with Allah in the Mother of the Book, and from there it was revealed to Muhammad (SAW) in two stages. At first, Allah sent the *Qur'an* down all at one time from the Preserved Tablet [6] to the House of Might (*Bayt-ul-Izzah*), which is in the heaven of this world. Then it came down in parts to the Messenger of Allah, based upon the incidents that occurred over a period of twenty-two years.

Revelation

The Prophet (SAW) received the first revelation in 610 CE, in the Cave of *Hira*, in the Mountain of Light (*Jabal-e-Noor*), two and a half miles away from the House of Allah in the city of *Makkah*. It was revealed in *Lailat-ul-Qadr* (Night of Decree) in the holy month of *Ramadhan*, through Angel *Jibreel* (AS). The *Qur'an* was revealed to Prophet Muhammad (SAW) in stages spreading over a period of 22 years and not as a complete book in one single act of revelation. It was done firstly to strengthen the heart of the

Prophet (SAW) by addressing him continuously and whenever the need for guidance arose; secondly, to gradually implement the laws of Allah; and thirdly, to make understanding, application and memorization of the revelation easier for the believers.

During the 22 years of the revelation, the Prophet (SAW) stayed at *Makkah* for about 12 years, and then migrated to *Madinah* in the year 622 CE, where the revelation continued for another ten years. Nearly two-third of the *Qur'an* was revealed at *Makkah*, while the remaining was revealed at *Madinah*, other than some *surahs* that were revealed during the migration from *Makkah* to *Madinah*.

Divisions of the Qur'an

The *Qur'an* has been divided into units, portions and sections, according to the convenience of the readers who wishes to complete it in a given time, and according to the subject matter. The Arabic terms used for these divisions are *Ayah, Ruku', Surah, Juz (Parah)* and *Hizb (Manzil)*. There are different interpretations in different English translations for these Arabic terms, but we will use most of these terms as they are in Arabic.

Ayah

Ayah is the basic unit of the *Qur'an*. As the *Qur'an* is the ultimate guidance from Allah (SWT) to the whole of Mankind, it is not at all surprising to find that its smallest divisions are called *ayaat* (signs). Every *ayah* is a sign of the Knowledge and the Wisdom of Allah. The terms *sentence* and *verse* are not appropriate to use in place of the word *ayah*, as the *Qur'an* is neither a book of poetry nor that of prose. The size of an *ayah* varies in different *surahs*. The smallest *ayah* in the *Qur'an* comprises only two letters i.e. *'Ha-Meem'*. On the other hand, an *ayah* can be as sizeable as *Ayat-ul-Kursi*, which is one of the lengthiest *ayaat* of the *Qur'an*. So the division or the length of an *ayah* is not based on any principal of Arabic grammar; instead, it is accepted as Prophet Muhammad (SAW) has informed us. There is a difference of opinion regarding the number of *ayaat* in the *Qur'an*, but it is a known fact that there are at least 6500 *ayaat* in the Glorious *Qur'an*.

Surah

Surah, plural *Suwar*, literally means '*row*' or '*fence*'. In *Qur'anic* terminology, it is the passage-wise division of the *Qur'anic* text. The *Qur'an* has 114 *surahs* of unequal length, the shortest consisting of three ayaat (*Al-Asr, Al-Kausar* and *An-Nasr*), whereas the longest, of 286 *ayaat* (*Al-Baqarah*). The *surahs* are not divided

into topics or subjects, quite unlike the books we are accustomed with, and the reader also encounters abrupt transitions from one subject matter to another within a *surah.* This is what makes the *Qur'an* a unique Book. Likewise, a *surah* does not contain any chapters or paragraphs. That is why these terms cannot be used interchangeably with the Arabic word *'surah'.*

Ruku'

The *surahs* are further divided into sections called *ruku's.* This division was not present at the time of the Prophet (SAW) or during the days of his Companions (RAA). It was done later on under the leadership of *Hajjaj Bin Yusuf*, for the convenience of readers and to enable a person to recite one *Ruku'* in one *Rak'at* of his *Salah* (Prayer).

Juz

The *Qur'an* is also divided into thirty well-known *'Ajza' (Parahs)* of approximately equal length for easy recitation during the thirty nights of a month, especially the month of *Ramadhan.* A *Juz* is generally indicated by the word it commences with and its number given alongside. This division of the *Qur'an* was also not present at the time of the Companions (RAA).

Hizb

The *Qur'anic* text is also divided into seven parts of approximately equal length, each part named as a *Hizb (Manzil).* It is indicated by the word *'manzil'* or *'hizb'* and the respective number in the margin. The first *hizb* comprises three *surahs*, excluding *Al-Fatihah*, while the others consist of five, seven, nine, eleven, thirteen and sixty-five *surahs* respectively.

This arrangement was done by the Companions (RAA) of the Prophet (SAW), to be able to recite the whole *Qur'an* in the course of a week, as indicated by the *Hadith*: *Aws bin Hudhayfah* said that he asked the Companions (RA) of the Prophet (SAW) how they used to divide the *Qur'an* during his lifetime; they said, *"Three, five, seven, nine, eleven, thirteen and the Mufassal* [7] *alone"* [8].

Pairs

Most of the *surahs* in the *Qur'an* form *pairs*. For example, *surah Al-Baqarah* and *surah Aal-e-Imran* are in the form of a pair. Similarly the *surahs Bani Israel* and *Al-Kahf* form a pair. They form pairs because of the similarities of the subjects addressed in them. There are also some unique *surahs*, like *surah Yasin*, which do not form a pair with any *surah*.

Makkan and Madinan Division

As part of studying the revelation of the *Qur'an*, scholars have categorized the *surahs* of the *Qur'an* according to the periods of their revelation. This is known as the *Makkan and Madinan division* of the *Qur'an*. The *surahs* revealed before *Hijrah* are named as *Makkan surahs*, whereas those revealed after *Hijrah* are termed as *Madinan surahs*. The *Makkan surahs* are 85, while the *Madinan surahs* are 28 in number. There is a consensus among scholars regarding the categorization of the *Makkan* and the *Madinan surahs* except for a few, like *surah Al-Hajj*, which is considered to be a *Makkan surah* by some, while others declare it to be of *Madinan* origin. Infact, both opinions are correct, as it contains ayaat of the *Makkan* phase as well as those of the *Madinan* period.

Groups

The *surahs* have also been divided by some scholars of the recent past, into seven *Makkan-Madinan* groups, each group starting with one or more *Makkan surahs* and ending with one or more *Madinan surahs*. Every group has a central theme, one aspect of which is described in the *Makkan surahs* of that group, while the other side of the picture is portrayed in the *Madinan surahs*.

Asbab-un-nuzool (Reasons of revelation)

The *Qur'an* has been revealed for guidance for all times and situations to come. However, various *ayaat* were related to a particular time in history and particular circumstances, and thus we ought to have knowledge about the reasons of revelation *(Asbab un-nuzool)* i.e. the knowledge about the events and circumstances in history that are related to the revelation of certain passages of the *Qur'an*. With the knowledge of the reasons of revelation, it is also to be decided whether the revelation has a specific implication *(Taavil-e-Khas)* or is of a general nature *(Taavil-e-Aam)*, and needs to be applied by all Muslims at all times.

The Order of Surahs

The complete *Qur'an* was revealed over a period of 22 years, portion by portion, as and when it was required. The sequence of the *ayaat* as they appear in the *Mushaf* [9] is different from its chronological order of revelation. The order and sequence of the *Qur'an* is based on Divine inspiration and was instructed to the Prophet (SAW) by Allah (SWT) through angel *Jibreel* (AS).

Compilation of the Qur'an

The compilation of the *Qur'an* was completed in three stages. First of all, Prophet Muhammad (SAW) received the revelation of the *Qur'an*

through angel *Jibreel* (AS). When the beloved Prophet (SAW) would receive a revelation, he would dictate it to a scribe, who would promptly write it down. The Prophet (SAW) had several such scribes, among whom *Zaid Bin Thabit* (RA) was very prominent. *Uthman* (RA) said that the Prophet (SAW) used to tell his scribes where to place a particular *ayah* that had just been revealed. He used to say: *"Place these ayaat in the surah, in which this and this is mentioned."* And when one *ayah* was revealed to him, he would say: *"Place this ayah in the surah in which this and this is mentioned"* [10]. The Revelation-scribes wrote down the *Qur'an*, according to the order of Prophet Muhammad (SAW), on pieces of cloth, leather, bones, and stones. Its *ayaat* were ordered and arranged according to Allah's inspiration. In the Prophet's lifetime, the *ayaat* were not gathered into one book. It was done afterwards in the period of *Abu Bakr* (RAA). The oral transmission of the revelation was based on memorization and Prophet Muhammad (SAW) himself was the first to commit a revelation to memory after the angel *Jibreel* (AS) had brought it to him. Every *Ramadhan*, all the portions of the *Qur'an* that had been revealed were revised and reconfirmed by the Prophet (SAW) with *Jibreel* (AS), according to the order of the *ayaat* revealed till that time. During the last *Ramadhan*, before the demise of the Prophet (SAW), the *Qur'an* was rechecked and reconfirmed twice.

The Prophet (SAW) also instructed his Companions (RAA) to memorize the *Qur'an*. *Abdullah Bin Masud* (RA) was the first man to publicly recite it at *Makkah*. It is also reported that *Abu Bakr* (RAA) used to recite the *Qur'an* in front of his house at *Makkah*. [11]. It is therefore clearly evident that the *Qur'an* was compiled and authenticated by the Prophet (SAW) himself during his lifetime, in written form as well as in the memory of several of his Companions (RAA).

In the second phase of the compilation of the *Qur'an*, it was collected as *Suhuf* (Loose pieces of writing material, such as paper and skin), during the Caliphate of *Abu Bakr* (RAA). Tradition informs us that in the Battle of *Yamama*, a number of Muslims who had memorized the *Qur'an* were killed and it was feared that unless a written copy of the *Qur'an* was prepared, a large part of the revelation might be lost. Therefore, *Abu Bakr* (RAA) ordered *Zaid-bin-Thabit* (RAA) to collect the *Qur'an*. *Zaid* (RA) collected it from various written materials and the memories of people. The sheets thus prepared were kept with *Abu Bakr*, then *Umar*, and then *Hafsah* (RAA). In these *suhuf*, the order of the *ayaat* within

each *surah* was fixed, but the sheets with the *surahs* on them were still in a loose arrangement i.e. not bound into a volume.

The *Qur'an* was finally compiled into a *Mushaf* (*Suhuf* collected into a volume), during the Caliphate of *Usman* (RAA), when the order of the *ayaat* within each *surah* as well as the order of the sheets was fixed. It was written from the main copy gathered during the era of *Abu Bakr* (RAA). It was kept at the residence of *Hafsah Bint Umar* (RAA). *Usman* (RAA), appointed the following scribes to do it:

1. *Zaid Ibn-e-Sabit.*
2. *Abdullah Ibn-e- Zubair.*
3. *Said Ibn-ul-'Aas.*
4. *Abdur Rahman Ibn-ul-Haris Ibn-ul-Hisham.*

They scribed many copies of the *Qur'an*, reflecting in their writing the different correct readings of it and excluding the incorrect ones. It was not marked with dots or vowel points. *Usman* (RA) kept a copy at *Madinah* and sent the remaining copies to the various Islamic countries.

Endnotes

[1] The Arabic word 'qur'an' is derived from the root qara'a, which has various meanings, such as to read, [Surah 17: 93.] to recite, [Surah 75:18:17: 46.] etc. *Qur'an i*s a verbal noun and hence means 'reading' or 'recitation'. As used in the *Qur'an* itself, the word refers to the revelation from Allah in the broad sense [Surah 17: 82.] and is not always restricted to the written form in the shape of a book, as we have it before us today.

[2] Surah Al-Hijr (15): 9.

[3]Surah Al-Burooj (85): 21,22. Al-Lawh: every wide, flat surface or sheet of wood.

Al-Azhari said: Al-Lawh is a flat surface of wood, and a shoulder-blade [of an animal], it is something that is written on. Al-Lawh-ul-Mahfooz, as in the ayah means, the place where the decrees of Allah are kept. The plural form is *alwaah.* (*Lisaan-ul-'Arab*, 2/584).

[4] Surah Al-Waqi'ah(56): 77, 78.

[5] Surah Az-Zukhruf (43): 3.

[6] Surah Bani-Israel (17) and Surah Al-Furqan (25).

[7] The last section of the Qur'an beginning with surah Qaaf, (50-114).

[8] Musnad Ahmed, Sunan Abi Dawood, Sunan Ibn Majah.

[9] The Qur'an in a single volume.

[10] Kitab-ul-masahif by Ibn Abi Dawud.

[11] The Life of Muhammad, Ibn Hisham.

Al-Fatihah

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

Introduction

Surah Al-Fatihah is one of the earliest revelations. Infact, we learn from authentic traditions that it was the first complete *surah* revealed to the Prophet (SAW). Before this, only a few miscellaneous ayaat were revealed which form parts of *surahs Al-Alaq*, *Al-Muzzammil* and *Al-Muddathir*.

This *surah* is called *Al-Fatihah*; the Opener of the Book, and the *surah* with which prayers are begun. It is the greatest *surah* in the *Qur'an,* and is also called *Umm-ul-Kitab* (Mother of the Book), because it contains the meanings of the entire *Qur'an*. Other names for this *surah* are: *Salah, Al-hamd, Umm-ul-Qur'an, As-Sab-ul-Mathani, Ash-Shifa, Ar-Ruqayyah, and so on.* Infact, more than fifty names have been enumerated by *Jalal-ud-Din As-Suyuti* [1], in his famous book "*Al Itqan fi Uloom il Qur'an"*.

Number of Ayaat

There has been a consensus of the majority of scholars since early generations that *surah Al-Fatihah* consists of seven *Ayaat*. However, they differ about whether *Bismillah* is a part of *Al-Fatihah,* and likewise every *surah*, or is a separate *ayah*. The first opinion, that *Bismillah* is a part of every *surah* except *surah At-Taubah,* is attributed to some Companions (RAA), *Imam Az-Zuhri, Imam Ash-Shafai, and Abdullah Bin Al-Mubarak*. They state that *Bismillah* is a part of *Al-Fatihah*, and the last *ayaat*; "*The Way of those whom You have favored"* and "*not of those who have earned Your wrath, nor of those who have lost The Way."* are not separate *ayaat* but a single *ayah*. On the other hand, *Imam Malik, Imam Abu Hanifa* and their followers say that *Bismillah* is not an *ayah* in *Al-Fatihah* or any other *surah*, and is a separate *ayah* in the beginning of every *surah*. In any case, there is no disagreement over the matter that *Al-Fatihah* has seven *Ayaat*. Those who consider the last two *Ayaat* as one *ayah* include *Bismillah* in it, while those who consider the last two as separate *ayaat* say that *Bismillah* is not a part of it.

Virtues of Al-Fatihah

This is the most important *surah* in the *Qur'an*, and there are a lot of *Ahaadith* which narrate the virtues of this *surah*. In the *Musnad of Imam Ahmed*, he has recorded that *Abu Hurayrah* (RAA) said that the Prophet (SAW) said to *Ubaiy Ibn Ka'ab* (RA) "*Would you like me to teach you a surah like which nothing has been revealed in the Torah, the Injeel, the Zabur (Psalms) or the Furqan (the Qur'an)*"? He said, "*Yes, O' Messenger of Allah!*" The Messenger of Allah said, "*I hope that I will not leave through this door until you have learned it.*" He *(Ubayy)* said, "The Messenger of Allah held my hand while speaking to me; meanwhile I was slowing down fearing that he might reach the door before he finished his conversation. When we came close to the door, I said: "*O' Messenger of Allah! Which is the surah you have promised to teach me*"? He said, "*What do you read in the prayer*"? *Ubayy* said, "*I recited Umm-ul-Qur'an to him*". He said, "*By Him in Whose Hand is my soul! Allah has never revealed in the Torah, Injeel, Zabur or the Furqan, a surah like it. It is the seven repeated verses that I was given*".

Al-Fatihah and Salah

Al-Fatihah is also called the *Salah*, because it is itself a prayer and reciting it is a condition for the correctness of the *Salah* (Prayer), as recorded by *Imaam Muslim* that *Abu Hurayrah* (RA) said that the Prophet (SAW) said: *"Whoever performs any prayer without reciting Umm-ul-Qur'an (Al-Fatihah), his prayer is incomplete." He said it thrice.* [2]

There is another *Hadith,* narrated *by Abu Hurayrah* (RA), that the Prophet (SAW) said; "Allah the exalted says, "I have divided the prayer (*Al-Fatihah*) into two halves between Myself and My bondsman. A half of it is for Me and a half for My bondsman, and for My bondsman is what he asks for."

When he says, *"All praise and thanks be to Allah, the Lord of the worlds"*, Allah says, *"My bondsman has praised Me."*

When the bondsman says, *"The Most Benevolent, the Most Merciful."* Allah says, *"My bondsman has glorified Me."*

When he says, *"Master of the Day of Judgment."* Allah says, *"My bondsman has dignified Me."*

When he says, *"You alone we worship, and You alone we ask for help."* Allah says, *"This is between Me and My bondsman, and for My bondsman is what he has asked for."*

When he says, *"Guide us to the straight path—the path of those whom You have granted, not of those who earned Your anger, nor of those who went astray"*, Allah says, *"This is for My bondsman, and for My bondsman is what he has asked for.'"*[3]

In this *Hadith*, the word *Salah* has been used in reference to *surah Al-Fatihah*, which also testifies the importance of this *surah* and reciting it in every *rak'ah* of the prayer.

Al-Fatihah is not merely an introduction to the *Qur'an*; it is a prayer of a person whose nature is not perverted and who has the faculty of reasoning. The rest of the *Qur'an* is the answer from his Lord. If a person is an earnest seeker of the truth, and recognizes that the Lord of the Universe is the source of all knowledge, he prays to Him to grant him guidance and Allah (SWT) places the *Qur'an* before him in response to his prayer.

Translation and Brief Elucidation

"I take Allah's refuge from Satan, the banished."

"In the name of Allah, the most Benevolent, the Most Merciful."

"All praise is for Allah, the Benefactor of the Worlds."

Al-Fatihah starts with the praise of Allah, who is the Lord and the Creator of this world and the Hereafter. It states that all thanks and praise are due to Allah alone, and nothing is to be worshipped except Him. He is the Sustainer and Owner of all that He has created in both *A'lams* (Worlds).

"The Most Gracious, the Most Merciful."

Ar-Rahman (Most Gracious) and *Ar-Raheem* (Most Merciful) are two words of the same root, *Ar-Rahmah* (the mercy). Allah is *Ar-Rahman* for all humankind and provides them with sustenance, irrespective of whether they believe in Him or not and whether they are good-doers or evildoers. On the other hand, He is *Ar-Raheem* for those who believe in Him and showers His special blessings on them in the form of bliss and contentment in this life and the best of rewards in the Hereafter.

"Master of the Day of Judgment."

After Allah (SWT) describes that He is *Ar-Rahman* and *Ar-Raheem*, He immediately gives a warning to His bondsmen not to forget that alongwith His mercy, He is also the Master of the *Day of Judgment* and every soul will be answerable to Him on that day.

"You Alone we worship and You Alone we call on for help."

After a person has praised Allah and thanked Him, he stands before Him, addressing Him directly: "O' Allah! Our worship, obedience, submission and devotion are all for You alone. O' Allah! We know that You are the Lord of the Universe and have power over everything; therefore, we turn to You alone to fulfill our needs and to help us worship You as you desire us to."

"Guide us to The Straight Path."

i.e. Make us firm on the straight path and do not let us deviate. The straight path mentioned here and elsewhere in the *Qur'an* refers to Islam. We have already mentioned the *Hadith* according to which, when a servant of Allah proclaims, *"Guide us to The Right Way"*, Allah says, *"This is for My bondsman and My bondsman shall acquire what he has asked for."*

"The Way of those whom You have favored."

Allah's servant prays to Him to guide him towards the straight path in every walk of life; the path of those upon whom He has bestowed His mercy i.e. people who are obedient to Allah and His Messengers.

"Not of those who have earned Your wrath, nor of those who have lost The Way."

A bondsman of Allah also prays to Him to help him avoid the path of those whom He is angry with, whose intentions are corrupt, and who know the truth but still deviate. The bondsman also asks for Allah's help to avoid the path of those who were led astray. These two paths are those of the *Jews* and the *Christians*. *"Not of those who have earned Your wrath'*, refers to the *Jews*, while *"nor of those who have lost The Way"* alludes to the *Christians*.

After completing the recitation of *Al-Fatihah*, it is recommended to say *Amin*, which means, *'O' Allah! Accept our invocation'*, for everyone and strongly recommended for those who are praying, as the Messenger of Allah (SAW) said: *"When any of you says in the prayer Amin, and the angels in the heaven say Amin in unison, his previous sins are forgiven."*[4]

Endnotes

[1] Abd-ur-Rahman Ibn Kamal-ud-Din Abi Bakr Ibn Muhammad Ibn Sabiq-ud-Din, Jalal-ud-Din Al-Misri As-Suyuti, (849-911), the mujtahid imam and renewer of the tenth Islamic century, foremost Hadith master, jurist, and historian, he authored works in virtually every Islamic science.
[2] Sahih Muslim.
[3] Sahih Muslim and Sunan An-Nisai.
[4] Sahih Muslim 1:307.